اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
ڈاکٹر ایم۔ڈی۔تاثیر: شخصیت اور فن
شبنم شکیل

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر ایم ۔ڈی ۔تاثیر
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر ایم۔ڈی۔تاثیر
شخصیت اور فن

شبنم شکیل

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	فخر زمان
منتظم	ظہیرالدین ملک
تدوین وطباعت	سعیدہ درانی
اشاعت	2008
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد:-/170روپے
	غیرمجلد:-/160روپے

ISBN: 978-969-472-181-1

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ''ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر :شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کی معروف شاعرہ، ادیبہ محترمہ شبنم شکیل صاحبہ نے تالیف کی ہے۔

اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری ڈاکٹر تاثیر کی فن و شخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

ڈاکٹر تاثیر کی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ افسانہ نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار، ڈرامہ نگار اور خوش گو شاعر کے علاوہ مختلف ادبی جرائد کے مدیر اور نامور ماہر تعلیم تھے ان کی پوری زندگی درس وتدریس میں گزری ہے۔

وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ان کی علمی اور ادبی کاوشیں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر تاثیر کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔

امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''ڈاکٹر ایم ۔ڈی تاثیر :شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

کوئی چار برس پہلے ٹیلی وژن کے ایک انٹرویو میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ بچپن میں آپ بہت سے مشاہیر بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملتی رہی ہیں ان میں سے آپ کی پسندیدہ شخصیت کون سی تھی؟ میں نے بے ساختہ کہا، ڈاکٹر تاثیر۔ پوچھا گیا کیوں اس کی وجہ؟ میں نے کہا وہ بہت خوش مزاج اور بچوں سے محبت کرنے والے تھے۔ مجھ پر تو خاص شفقت تھی اُن کی۔ حسِ مزاح بھی خوب تھی۔ ایک واقعہ سناتی ہوں، میں نے ابھی نیا نیا فون اٹھانا اور اپنی طرف سے ذرا مہذب طریقے سے گفتگو کرنا سیکھا تھا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر تاثیر نے فون کر کے پوچھا کون بول رہا ہے؟ میں نے کہا۔ ''عابد صاحب کی صاحب زادی ہوں'' وہ بہت ہنسے۔ فوراً گھر آئے اور کہا ذرا عابد کی صاحب زادی کو بلواؤ۔ میں شرم کے مارے الماری کے پیچھے چھپ گئی مگر انہوں نے ڈھونڈ نکالا اور بہت پیار کیا۔ وہ محفل میں بیٹھ کر بہت ہنساتے رہتے تھے۔ ہم لوگوں کی نقلیں اتار کر ہم بچوں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ہمیں لطیفے سناتے۔ اپنے گھر پر بلاتے۔ مریم کی سالگرہ پر خود بھی بچوں کی پارٹی میں شریک ہو کر کھیلتے رہے۔ غرض کہ انتہائی دلکش اور دلچسپ شخصیت تھے۔ اُن کی وفات کے بعد بھی ہم لوگوں کا اُن کی فیملی سے ملنا جلنا رہا۔

جب اکادمی ادبیات پاکستان نے مجھ سے ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھنے کے لیے کہا تو مجھے اچھا لگا۔ سلمہ ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی بیٹی ہے

اور میرے ساتھ بہت عرصہ لاہور کالج میں پڑھاتی بھی رہی ہے(ڈاکٹر صاحب کی دونوں بیٹیاں سلمہ اور مریم میرے بچپن کی دوست ہیں) میں نے سلمہ سے یہ بات کی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ بولی شبنم تم ضرور یہ کتاب لکھو۔تم سے زیادہ ہمارے بچپن سے کون واقف ہوگا۔ اور ڈیڈی تو ویسے بھی تم لوگوں سے پیار کرتے تھے۔تمہارے والد سے اُن کی دوستی بھی مثالی تھی۔ کاش ماما (ماں) زندہ ہوتیں تو جو کچھ میں اپنے ڈیڈی کے بارے میں بتا سکتی ہوں اس سے دس گنا زیادہ وہ بتاتیں۔ خیر تم یہ نیک کام شروع کر دو۔ چنانچہ سلمہ نے اپنے والدین خاص طور پر والد کے حوالے سے اپنے ذاتی تاثرات بھی مجھے لکھ کر بھیجے جن سے ڈاکٹر صاحب کی زندہ دل شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ایک شفیق باپ تھے بلکہ اپنی بیوی کے سچے غم خوار اور ساتھی تھے اور دونوں آپس میں گہری محبت رکھتے تھے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار کے علمبردار تھے۔ خاص طور پر تعلیم کے حوالے سے تو اُن کی خدمات قابلِ ذکر ہیں سو وہ جب تک زندہ رہے پاکستان میں فروغ تعلیم کے اعلیٰ نصب العین کے لیے کوشاں رہے۔

یوں میں نے جس سے بھی ذکر کیا کہ میں ڈاکٹر تاثیر پر کام کر رہی ہوں تو اس نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب جو بھی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ کیونکہ میں اب اتنی تندرست نہیں رہی کہ کسی کام پر زیادہ محنت کر سکوں۔

ڈاکٹر تاثیر کے تین بچے ہیں۔ سلمہ، مریم اور سلمان۔ سلمہ بہت ذہین اور پڑھی لکھی خاتون ہیں اور آج کل بھی کراچی کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ مریم شادی کے بعد امریکہ چلی گئیں، وہ بھی بہت تعلیم یافتہ ہیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے سلمان تاثیر ہیں جو آجکل پنجاب کے گورنر ہیں وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

عمر، تخلیقی کارکردگی اور شہرت سے مل کر جو مثلث بنتی ہے اس کا ایک زاویہ بالعموم گریزاں رہتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ عمر پانے والوں کا عمومی المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پیچھے رہ جاتے ہیں اور زمانہ آگے نکل جاتا ہے۔

دنیائے ادب میں ایسی شخصیات بھی ہیں جنہوں نے تھوڑی سی زندگی کے باوجود اتنا کام کیا کہ موت اور وقت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو اور پروین شاکر کا اس ضمن میں بطور خاص نام لیا جا سکتا ہے، ان میں سے کوئی بھی پچاس تک نہ پہنچا لیکن جریدۂ عالم میں اپنا نام ثبت کر گئے اور یہی ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کا بھی معاملہ ہے۔ انہوں نے اڑتالیس برس میں اتنا کام کر لیا کہ تاریخِ ادب کا مؤرخ اُن کے نام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

انہوں نے شاعری بھی کی افسانے بھی لکھے، ناول بھی، انشائیے اور ڈرامے بھی، فکرِ اقبال کے متنوع پہلو اجاگر کرنے کے لیے متعدد مقالات قلم بند کیے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔

بعض ادبی جرائد سے بھی مدیرانہ حیثیت میں وابستہ رہے اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ کامیاب معلم بھی تھے حتیٰ کہ پرنسپل ہونے کے باوجود بھی کلاسیں لیتے تھے۔ اُردو تو خیر پنی زبان تھی وہ انگریزی بھی ماہرانہ انداز میں بولتے تھے۔ اس لیے ان کے لیکچرز یقیناً دلچسپ اور پُر مغز ہوتے ہوں گے۔ وہ مجلسی انسان تھے اور ہر محفل میں مرکزِ نگاہ ہوتے۔ بذلہ سنجی ان کی گفتگو کو مزید دلچسپ بنا دیتی۔

ڈاکٹر تاثیر نے بہت کچھ لکھا لیکن شاعری ان کی اولین ترجیح تھی۔ شاید اسی لیے مزاج میں شاعرانہ بے نیازی پیدا ہو گئی۔ زندگی میں کوئی کتاب شائع نہ کرائی۔ تمام کتابیں نتقال کے بعد شائع ہوئیں۔ الغرض ڈاکٹر تاثیر نے تمام عمر لکھنے پڑھنے اور معلمی میں

بسر کی۔ اُن کی ہمہ گیر تخلیقی شخصیت کی تمام جہات کا تذکرہ اِس تعارف میں ممکن نہیں۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی بات ختم کروں مجھے خاص طور پر سعیدہ درانی کا ذکر کرنا ہے کیوں کہ اگر وہ اس کتاب کے حوالے سے اپنے پورے خلوص اور لگن سے میری مدد نہ کرتیں تو شاید میں یہ کتاب مکمل نہ کر پاتی۔

آخر میں، میں ڈاکٹر تاثیر کی ایک ایسی انوکھے انداز کی غزل پر آپ سے اجازت چاہتی ہوں کہ جس غزل کے معترف تمام اہل ذوق ہیں

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
مزاج ایک، نظر ایک ،دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں
ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں
جنابِ شیخ ، وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لب جو نکل ہی آتے ہیں

شبنم شکیل

خاندانی پسِ منظراور شخصیت

پراس کے اثرات

ڈاکٹر محمد دین تاثیر آسمانِ علم و ادب کا درخشندہ ستارہ جسے ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اپنی شہرت کے عروج پر جل بجھا۔ ڈاکٹر تاثیر کی جائے پیدائش اجنالہ ضلع امرتسر (بھارت) ہے، جس کے بارے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کے عزیز دوست اور شاگردِ رشید، حمید احمد خان نے اپنے مضمون ''تاثیر زندہ باد'' میں تحریر کیا ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب کے والدین اور دیگر لواحقین ۱۹۰۴ء کی طاعون کی وبا میں پیوست رحمتِ حق ہوئے جو سب اجنالہ میں مقیم تھے۔''

اپنے ایک مضمون ''میرا عہدِ طفلی''، میں ڈاکٹر تاثیر خود ذکر کرتے ہیں:

> ''وہ تین برس کے تھے جب انہیں وبا کے دوران اجنالہ سے لاہور بھجوایا گیا جہاں ان کی خالہ نے انہیں گود لے لیا۔''

ڈاکٹر تاثیر کی خالہ مظفر بیگم، میاں نظام الدین کی تیسری بیوی تھیں اور خود بے اولاد تھیں۔ میاں نظام الدین عرفِ عام میں نظام الدین بارود خانے والے کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کے اپنے والد کا نام چوہدری عطر دین تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاثیر اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے کیونکہ ان کے اور کسی بہن

بھائی کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اجنالہ گاؤں امرتسر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے اور اجنالہ میں ان کا پیشہ زمینداری تھا یقیناً زمینیں بھی تھیں۔ حالات و واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ طاعون کی وبا میں ڈاکٹر تاثیر کے خاندان کے تمام افراد ہلاک ہو گئے تھے جن میں چوہدری عطر دین (والد ڈاکٹر تاثیر)، زیتون بیگم (والدہ ڈاکٹر تاثیر) اور دیگر افراد کنبہ شامل تھے۔

تین برس کی عمر میں تاثیر، میاں نظام الدین کی حویلی واقع لاہور میں آ گئے جہاں ان کی پرورش حقیقی اولاد کی طرح کی گئی۔

واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر اپنے منہ بولے والدین کے بہت لاڈلے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کہیں باہر دیر تک رہے تو والدین کو بہت تشویش ہوئی۔ مظفر بیگم تو سجدے میں گر گئیں۔

نظام الدین کی حویلی میں ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا، جس کا تعلق بارود خانے والوں سے تھا، جہاں نظام الدین رئیس لاہور اور ان کی بیگم، مظفر بیگم، ڈاکٹر تاثیر کے حقیقی والدین کا صحیح نعم البدل ثابت ہوئے۔ جنہوں نے انہیں پڑھایا لکھایا، ان کی تربیت کی بلکہ انہیں بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجا۔ یقیناً ڈاکٹر تاثیر کی اسلامیہ کالج میں بطور پرنسپل کے تعیناتی سے بھی اس خاندان کا تعلق تھا کیونکہ انجمن حمایت اسلام ان کے زیرِ اثر تھی۔

اب رہا معاملہ ان کی تاریخ پیدائش کا تو خود ان کے بیان کے مطابق:

> ''ان کی نقل مکانی انتہائی خطرناک حالات میں اجنالہ سے لاہور ہوئی
> یعنی طاعون کی وباء کے دوران۔''

یہ وبا ۱۹۰۴ء میں پھوٹی تھی۔ جب یہ سب علاقہ اس وبا کی زد میں آیا تب وہ اپنے آپ کو

تین برس کا بیان کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۱ء بنتی ہے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر تاثیر پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کا درست ریکارڈ رکھنا کوئی بہت اہمیت نہیں رکھتا تھا چنانچہ وہ خود بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن ان کے میٹرک، ایف۔ اے اور دیگر امتحانات میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۱ء ہی درج ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتی ہوں کہ ۱۹۰۱ء بطور تاریخ پیدائش کے سب سے زیادہ قرین قیاس ہے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر تاثیر کی پرورش اور تربیت میاں نظام الدین، لاہور کی حویلی کے علمی، ادبی اور مذہبی ماحول میں ہوئی، کیونکہ میاں صاحب خود عربی اور فارسی کے فاضل اور بڑے صاحب ذوق اور علم دوست تھے۔ قرآن کریم اور دیگر مذہبی کتابوں کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے۔ جناب علامہ اقبالؒ سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے وہ اپنی کتابیں میاں نظام الدین کو بھیجا کرتے تھے۔ اور اکثر ان کی حویلی میں آیا کرتے تھے ۔میاں نظام الدین، میاں امیر الدین کے سگے تایا تھے، میاں امیر الدین کے صاحبزادے میاں صلاح الدین کی شادی علامہ اقبالؒ کی بیٹی منیزہ سے ہوئی تھی۔ ان سب کے آپس میں خاندانی مراسم کے علاوہ بہت زیادہ میل جول تھا۔ بقول میاں امیر الدین:

> ''میاں نظام الدین نے تاثیر کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا اور ان بہت دیکھ بھال کی۔ تاثیر کی خالہ مظفر بیگم نے بھی ان کی پرورش میں بنیادی کردار ادا کیا اور حقیقی ماں کی طرح ان سے محبت کی۔''

ڈاکٹر تاثیر اور ان کے تمام خاندان کے افراد، مظفر بیگم کو ''بے جی'' کہہ کر بلاتے تھے، وہ

بہت نیک طینت اور رحم دل خاتون تھیں۔ بقول بلقیس تاثیر:

"She was an embodiment of love which

she showered upon every one."

میاں صلاح الدین کا بیان ہے:

''میاں نظام الدین نے تاثیر کو اسی اسکول میں (اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ) داخل کروایا جہاں ان کا حقیقی بیٹا ایم اسلم زیر تعلیم تھا تاثیر نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول سے حاصل کی جو اس زمانے میں لاہور کا ایک اچھا اور مشہور ادارہ تھا واقعات کے مطابق تاثیر کی شعر گوئی کا سلسلہ بھی اسکول کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔''

اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالا گیٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تاثیر کا داخلہ ایف۔سی کالج، لاہور میں کروایا گیا۔ جو اس زمانے میں بڑی شہرت کا حامل تعلیمی ادارہ تھا۔ تاثیر ۱۹۱۸ء میں ایف۔سی کالج میں داخل ہوئے اور اپنی زندگی کے چھ برس وہاں گزارے۔اس زمانے میں ایف سی کالج کے پرنسپل، انگریز تھے۔اور ان کا نام، ای، ڈی، لوکاس (E,D,LOKAS) تھا، انگریزی ادب کے اساتذہ میں ای، بی، سٹیکلر اور سی ایچ رائس تھے جو بین الاقوامی شہرت کے حامل اساتذہ تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ۱۹۲۴ء میں ایم۔اے انگریزی کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ایف، سی، کالج کے ''ادبی میگزین'' میں ان کے مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ کالج میں چھ سالہ تعلیم وتربیت نے تاثیر کی طبیعت کو ایسی جلا بخشی جو زندگی بھر کے لیے ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ اساتذہ کی خصوصی توجہ، ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے

مواقع اور کالج کے اعلیٰ ادبی اور تہذیبی معیار نے انہیں ایسی شخصیت میں ڈھال دیا جو، اب کارزارِ زندگی میں قدم رکھنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "واٹرلو کی جنگ" ایٹن (ETON) سکول کے کھیل کے میدان میں جیتی گئی تھی۔ یعنی اس جنگ میں حصہ لینے والے اکثر لوگ جنرل ایٹن (ETON) پبلک سکول کے تعلیم یافتہ تھے جہاں کھیل کے میدان میں طلبہ کی عملی تربیت ہوتی تھی۔ اس تربیت نے انہیں عملی زندگی میں ایک مکمل اور باوقار شخصیت بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب تاثیر کی علمی اور ادبی شخصیت کی تعمیر ایف۔سی کالج کے کیمپس میں ہوئی۔ ان کے اساتذہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان ہی سے تاثیر نے شاگردوں کے ساتھ ایک خصوصی تعلق بنانے کا ملکہ حاصل کیا۔ اور انہیں پتہ چلا کہ استاد کس طرح طالب علم میں علم کا ذوق پیدا کرتا ہے اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ بطور استاد کے ڈاکٹر تاثیر نے جو ناموری حاصل کی اس میں ایف سی کالج کے علمی ماحول اور ان کے نامور اساتذہ کی کاوش کو بہت دخل ہے۔

عملی زندگی کا آغاز

۱۹۲۴ء میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر تاثیر نے اسلامیہ کالج کے اساتذہ کے تربیت کے شعبے میں ملازمت اختیار کی۔ جہاں وہ جے۔اے۔وی کے طلباء کو انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ ملازمت ۱۹۲۶ء میں شروع کی اور کوئی ایک برس جاری رہی۔ ڈاکٹر تاثیر کی اس تعلیمی کاوش کو اتنا پسند کیا گیا کہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر تاثیر بی ٹی کر کے سکول میں معلم ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ میدان علم و ادب کے اس نامور شہسوار کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا ہوا تھا۔

۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر تاثیر کو بطور ''لیکچرار انگریزی'' اسلامیہ کالج میں تعینات کیا گیا۔ جہاں انہوں نے کیمبرج روانگی تک کام کیا۔ ان کی یہ ملازمت ان کی خواہش کے عین مطابق تھی ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو اس عرصہ میں خوب پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ جہاں ایف سی کالج نے بطور طالب علم ان کی شخصیت کو جلا بخشی تھی، اسلامیہ کالج کے عرصۂ ملازمت نے مہمیز کا کام کیا اور اب ڈاکٹر تاثیر بیرون ملک تعلیم کے لیے بالکل تیار تھے۔

عبداللہ چغتائی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر تاثیر نے آتے ہی اسلامیہ کالج کے میگزین ''کریسنٹ'' کی طرف توجہ دی اور اس کے رنگ روپ اور سائز کو نکھارا۔''

بطور لیکچرار اپنے آغاز ملازمت سے لے کر ۱۹۳۲ء تک ڈاکٹر تاثیر ''کریسنٹ'' کے ایڈیٹوریل بورڈ کے چیئرمین رہے۔ اس عرصہ میں ان کی نظمیں، غزلیں اور مضامین باقاعدگی سے ''کریسنٹ'' میں چھپتے رہے۔

اسی عرصہ میں تاثیر نے ''بزمِ فروغ اردو'' کی بنیاد رکھی ۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ''بزمِ فروغ اُردو'' کا قیام ایک نہایت اہم سنگ میل ہے۔ جس نے کالج کی علمی ادبی اور ثقافتی زندگی میں انقلاب بپا کر دیا۔

''بزمِ فروغ اردو'' ۱۹۵۷ء تک قائم رہی۔ جب ڈاکٹر تاثیر اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج چلے گئے تو ''بزم فروغِ اردو'' کے سیکرٹری محمود نظامی کے نام خطوط کے ذریعے بزم کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس دوران بزم میں پڑھے جانے والے مقالات کی دو جلدیں بھی شائع ہوئیں۔ جن کا دیباچہ ڈاکٹر تاثیر نے تحریر کیا۔ ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت اس قدر پُراثر تھی کہ اس زمانے کے جید اور نامور علما اور ادیب ان کی وجہ سے ''بزم فروغ اردو'' کی طرف متوجہ ہوئے۔ سر عبدالقادر، سیّد امتیاز علی تاج ، پنڈت ہری چند اختر،

مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، حکیم احمد شجاع، غلام مصطفےٰ تبسم، اور خواجہ دل محمد جیسے اہل علم ڈاکٹر تاثیر کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ نوجوان طلباء میں ذوق علم پیدا کرنے میں ڈاکٹر تاثیر کو کمال حاصل تھا۔ ویسے تو استاد اور شاگرد کا رشتہ ایسا ہے کہ اس کا بندھن زندگی بھر کبھی نہیں ٹوٹتا مگر ڈاکٹر تاثیر کے شاگردوں کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے استاد سے عشق کرتے تھے۔ محمود نظامی، حمید نسیم، حفیظ جاوید، خضر تمیمی جس محبت اور عقیدت سے ڈاکٹر تاثیر کا ذکر کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استاد کے دل میں شاگردوں کے لیے کیا جذبات تھے اور شاگردوں نے کس طرح ٹوٹ کر اپنے استاد سے محبت کی۔

ان دنوں ''مخزن'' اور'' نیرنگ خیال'' میں ڈاکٹر تاثیر کے مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر کی علمی اور ادبی کاوشیں فقط کالج کی فضا تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے ''کارواں'' کے نام سے ایک علمی اور ادبی مجلّہ جاری کیا جو بطور سالنامے کے چھپتا تھا۔ اس کے دو سالنامے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے اور زبردست آن بان کے ساتھ اس سالنامے میں اپنی ادبی کاوشیں شائع کرنے کے لیے اہل علم وادب کھنچے چلے آتے تھے۔ تاثیر کی کیمبرج روانگی سے قبل ایک سالنامہ شائع ہوا جبکہ ان کے کیمبرج میں قیام کے دوران جناب مجید ملک نے ایک اور شمارہ زیور طبع سے آراستہ کیا۔ ''کارواں'' کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ علمی اور ادبی حسن و جمال کا مرقع تھا۔ مقامی علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ غیر ملکی ادبی شہ پاروں کے تراجم بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ افسوس کہ اس مجلّے کے صرف دو شمارے منظر عام پر آسکے اور تاثیر کے کیمبرج جانے کے باعث اسے جاری نہ رکھا جا سکا۔ اس طرح سے آسمان علم وادب کا یہ درخشندہ ستارہ ''دو اشاعتوں'' کے بعد جلد بجھ گیا۔

علامہ اقبالؒ کی رفاقت اور کیمبرج میں حصول تعلیم

ڈاکٹر تاثیر حصولِ علم کے اس قدر دلدادہ تھے کہ ان کے لیے ایم۔اے کر کے کسی کالج میں لیکچرر ہونا بہت ناکافی تھا۔ علامہ اقبالؒ سے ان کی ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں جن کی محبت نے ان کے شوق علم کو مہمیز کیا۔ علامہ ہی نے انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کی درسگاہ میں داخلے کا مشورہ دیا۔ جہاں تک تاثیر کا تعلق تھا ان کا ارادہ انگریزی میں اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کا تھا اس کے لیے انگلستان اس وقت مناسب ترین جگہ تھی۔ ڈاکٹر تاثیر کا ارادہ تو فوراً پی ایچ ڈی پر کام کرنے کا تھا مگر انہیں وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں یونیورسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی غیر ملکی طالب علم کو خواہ وہ امریکی کیوں نہ ہو، براہ راست پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ اس سے پہلے ایم۔لٹ یعنی ماسٹر ان لٹریچر کروایا جائے گا۔ یہ ایک طرح سے دوبارہ ایم اے کروانے کے برابر تھا یعنی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غیر ملکی طلباء کی بنیاد انگریزی میں اتنی مضبوط نہیں ہے کہ فوری طور پر پی ایچ ڈی پر کام کر سکیں چنانچہ ایک طرح سے انہیں ایک ابتدائی کورس کروایا جاتا تھا تاکہ بعد میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ وہاں ان دنوں عام طلباء کو بی اے ٹرائی پوس (Tripos) میں داخلہ دیتے تھے جو کہ بڑی کروفر کی ڈگری ہے اور تحقیق کے طلباء کو ایم۔لٹ بھی جس کے بعد انہیں پی ایچ ڈی کے لیے

اہل قرار دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر تاثیر کو علامہ اقبالؒ نے ایک سفارشی خط تحریر کر کے دیا ان دنوں یعنی ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبالؒ کا یورپ اور خصوصاً انگلستان میں بڑا شہرہ تھا۔ تاثیر کے نگران آرتھر کوچ نے ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اندازہ کر لیا کہ اس طالب علم میں بڑا جوہر قابل چھپا ہوا ہے چنانچہ آرتھر کوچ نے کیمبرج یونیورسٹی کی سینٹ کو تحریر کیا کہ تاثیر کی علمی استعداد اور مضبوط پس منظر کے پیش نظر انہیں براہ راست پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ تاثیر کے نگران کی سفارش کے پیش نظر یہ اجازت دے دی گئی اور بجائے ایم۔لٹ کے براہ راست پی۔ایچ ڈی کی اجازت مل گئی۔ اپنے ایک خط بنام محمود نظامی وہ یہ تحریر کرتے ہیں:

''انہیں ایم لٹ کے ڈربے سے نکال کر پی ایچ ڈی کے ٹاپو میں بند کر دیا گیا ہے۔''

آرتھر کوچ بڑے پائے کے ادیب تھے اور بے شمار کتابوں کے مصنف چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر تاثیر کے قیام کیمبرج کے دوران کی تربیت اس انداز سے کی کہ حصول علم تو خیر اپنی جگہ تھا۔ ڈاکٹر تاثیر نے غیر نصابی ادبی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اپنی ادبی سرگرمیوں کا ذکر انہوں نے محمود نظامی اور عبدالمجید سالک کے نام خطوط میں کیا۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کو لیکچر وغیرہ دینے کے لیے انگلستان سے باہر بھی بلایا جاتا تھا اور ان کی شہرت بطور سکالر اور ادیب، فرانس اور دیگر ممالک تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع یہ تھا:

"India and the near east in English Literature from the earliest time to Iqbal the Universal Poet."

شادی خانہ آبادی

کیمبرج میں قیام کے دوران تاثیر کی ملاقات دو انگریز نژاد بہنوں کرسٹبل جارج اور ایلس جارج سے ہوئی۔ دونوں بہنیں اپنی ترقی پسند سوچ اور اپنی روشن خیالی کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران تاثیر اور کرسٹبل کی دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی۔

تاثیر ان کے والد مسٹر H-Heffer George سے ملے۔ وہ ان دنوں کیمبرج میں کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔

انہوں نے تاثیر کو پسند کیا اور یہ طے پایا کہ تاثیر پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے بعد کرسٹبل سے شادی کرلیں گے۔(بعدازاں کرسٹبل کی بہن ایلس جارج کی شادی فیض احمد فیض سے ہوئی اور ان کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا)

منگنی سے قبل ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرسٹبل جارج نے اسلام قبول کرلیا تھا اور خیال تھا کہ ڈاکٹر تاثیر جب ہندوستان واپس جا کر ملازمت وغیرہ شروع کردیں گے تو دونوں اپنی نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ہندوستان میں اپنی پوزیشن، قبول اسلام کے نتائج اور دیگر عوامل سے کرسٹبل جارج کو آگاہ کردیا تھا۔ کرسٹبل جارج کا اسلامی نام بلقیس رکھا گیا۔ شادی کی رسم میاں نظام الدین کی حویلی واقع بارود خانہ لاہور میں سرانجام دی گئی۔ اس رسم میں نکاح کے وقت علامہ اقبالؒ موجود تھے جنہوں نے بلقیس

کا نکاح پڑھایا اور گواہ کے طور پر نکاح نامے پر دستخط بھی کیے۔ اس نکاح نامے کا مسودہ علامہ اقبالؒ نے خود تیار کیا تھا۔ اس زمانے میں نکاح نامے رجسٹر نہیں ہوا کرتے تھے۔ مگر اس دستاویز کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر اسے رجسٹر بھی کروایا گیا۔ نکاح میں ایک شرط یہ بھی رکھی گئی کہ ڈاکٹر تاثیر بلقیس سے شادی شدہ زندگی کے دوران کسی بھی مذہب کی عورت سے دوسری شادی نہیں کر سکیں گے یعنی یہ شادی یک زوجی ہوگی۔ شادی کی تقریب ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی۔ جس میں اس وقت کے مشاہیر نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ اس کے دو برس بعد یعنی ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ وفات پا گئے۔

کرسٹبل جارج جن کا اسلامی نام بلقیس تاثیر تھا بڑی حوصلہ مند اور سلیقہ والی خاتون تھیں۔ شادی کے اس بندھن سے تین بچے ہوئے۔ سلمہ۔ مریم اور سلمان۔ ڈاکٹر تاثیر کی وفات کے وقت تینوں بچے نوعمر تھے خاص طور پر سلمان فقط چھ برس کے تھے۔ اس موقع پر سیّد عابد علی عابد نے ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا اور نہ صرف مسز تاثیر کو دیال سنگھ کالج میں ملازمت دی بلکہ ان کے تمام چھوٹے موٹے مسئلے حل کرنے میں ان کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نیک دل اور صابر خاتون کو اپنے خاوند کی وفات کے بعد کسی اور المیے سے دوچار نہ کیا اور انہوں نے اپنی بچیوں کی شادیاں اور بیٹے کی تعلیم جیسے فرائض کو بطریق احسن سرانجام دیا۔ دیال سنگھ کالج میں ملازمت کے علاوہ مسز تاثیر انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں بچوں کا صفحہ بھی ایڈٹ کرتی تھیں۔ یوں ڈاکٹر تاثیر کے جانے کے بعد انہوں نے بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ یہ خاندان میسن روڈ پر ہی مقیم رہا اور بہت سادگی اور وقار سے زندگی بسر کرتا رہا۔

یہاں ڈاکٹر تاثیر کی بڑی بیٹی سلمہ نے (اپنے بچپن کے حوالے سے) کچھ تاثرات تحریر کیے ہیں جو انگریزی زبان میں ہیں انہیں من و عن درج کیا جا رہا ہے:

Childhood Memories

BY Salma Mahmud

My earliest memories of my father are connected with Amritsar, where he was Principal of MAO College, a position he attained after he had gained his PhD, in English Literature, from Pembroke College, Cambridge. He was the first Indian to achieve this distinction. While he was in England, he met my mother, Christabel George, who was Personal Secretary to Sir Stanley Unwin, the distinguished Chairman of Allen and Unwin, Publishers. My parents fell in love and decided to get married. My father went to his "future in-laws" to formally ask for their daughter's hand in Marriage, which totally charmed my grandparents.

My father felt that his "future bride" should be absolutely sure about her choice of marriage partner, and so advised my mother to follow him to India, after a whole year, during which

she could make her final decision. In 1936 she sailed for India, and upon her arrival was met at Bombay by my father, who carried her off to his Uncle and Aunt's house in Barudkhana, Lahore. Here the wedding ceremony was presided over by Allama Iqbal, who was the Qazi, and who drafted the marriage document, which was unique and historic, for in it my father gave the right of divorce to my mother.

I was born a year later in Baramula, Kashmir, and was brought back after the hot summer months to my parents' palatial colonial bungalow, allotted to the Principal. This was where friends used to come every weekend from Lahore by train, to spend time with my father and his colleagues, who included Faiz Ahmed Faiz, and Sahibzada Mehmood Uzaffar, the Marxist intellectual, husband of Dr. Rashid Jehan, who introduced Faiz to Socialism. The gatherings at the Principal's house were legendary, for writers, poets and critics would come there and spend entire nights exchanging thoughts and concepts. Many Mushairas were held at MAO College during my father's tenure, as well as Debates and Milads. His office is still pointed out to visitors in a college which has now become Guru

Nanak Dev University.

My father's aunt, Bebeji, who had brought him up from the time he was three years of age, spent a lot of time with us in Amritsar, and I can still recall the marvellous stories she would tell me every night, culled from the treasure trove of Gui-e-Bakavali tales and the Dastaan-e-Amir Hamza.

I grew up in a house full of books, for these were my father's first love after his family, and this passion has remained with me all my life. My father showered me with books first, and dolls afterwards. Even the latter were exceptionally stylish, such as a stunningly beautiful Louis Xvth doll in a ceremonial lavender-coloured taffeta gown. As for books, well, I read "War and Peace' at the age of twelve, simply because it was there, and thoroughly enjoyed it.

After Amritsar our next port of call was Srinagar, where my father was the first non-valley Kashmiri to be appointed Principal of Sri Pratap College, an appointment which roused great fury in the hearts of the Kashmiri Pundit intellectuals who hankered after the post. The Hindu staff and students planned to boycott my father's arrival, but within a short

period of time he won them over with his kind and gracious behaviour.

During his tenure in Srinagar my father planned a campaign with the help of Kashmiri Muslims, to encourage the enrollment of Muslim students in the college, and this was a very successful venture. To this day he is remembered in Srinagar as a patron of the cause of Kashmiri Muslims. He granted and established generous scholarships for needy Muslims, giving them free board and lodging as well as uniforms and books, and often paying for their requirements out of his own pocket. His generosity became a legend.Heleft Srinagar, and its beautiful surroundings because he found the grip of the Dogra Maharaja a stifling one, and joined the Government of British India in the capacity of Deputy Secretary War Publicity, and then in the same position in the Labour Department. These posts were based in Simla and then in Delhi, and in both cities our home was a centre of intellectual activity, especially our roomy bungalow in Lodhi Road, where writers like E.M. Forster visited us; and Professor V.G. Kiernan, translator of Iqbal and Faiz, was a frequent guest. My father was a generous host,

and in this role he was aided by my mother, who was as large-hearted as he was. This quality she no doubt inherited from her parents, who themselves were loving and generous individuals. During the time of the Great Depression of the Thirties, their home in London was always open to needy relatives. Their visit to India during the Partition period was a great event, and they won the hearts of all who met them with their ebullient and colourful personalities. I am proud to be descended from such distinguished and unusual ancestors.

My mother was a unique person, who was widowed very tragically at the age of 38, and who decided to stay on in what was then Pakistan, for she felt that by leaving, she would be betraying her beloved husband's patriotic love for his new country, for which he had many idealistic dreams. He died at the age of 48, on the eve of being appointed Vice-Chancellor of Punjab University, after spending two years as Principal of Islamia College, Railway Road. No doubt the map of Pakistan's education would have been a very different one if he had lived to a ripe old age.

My parents enjoyed an ideal marital

relationship, based on love and friendship and companionship, and my mother adapted herself perfectly to the role of an Eastern wife, bringing up her children in a traditional manner. She wore saris and shalwar qameez, the former chosen with great taste by my father. She enjoyed the most delightful rapport with her mother-in-law, even before she learned any Urdu, for both ladies were innocent of heart and kindly in their natures. They never exchanged a cross word throughout the time they spent together. Such people are not born very often in any century, and I was indeed fortunate to have been a part of their support and protection.

ڈاکٹر تاثیر کا سفرِ آخرت

ڈاکٹر تاثیر لمبے قد اور بھاری ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ انہیں خوراک میں جو چیزیں پسند تھیں مثلاً گوشت، تلی ہوئی مچھلی، پراٹھے۔ یہ سب اگر مناسب ورزش نہ کی جائے تو صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ گاؤٹ کی تکلیف جس سے جوڑوں میں دردسوجن ہو جاتی ہے یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے حملہ آور ہوتی ہے۔ جب وہ دبلے بھی تھے تو انہیں گاؤٹ کی بہت تکلیف ہوتی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد یہ بھی پتہ چلا کہ انہیں ذیابیطس کا مرض بھی ہے۔ اس مرض کی تشخیص تو ۱۹۴۷ء یا اس کے آس پاس ہوئی مگر ایسا لگتا تھا کہ یہ تکالیف انہیں کافی عرصے سے تھیں اور چپکے چپکے ان کے دل اور گردوں کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی خوش خوراکی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور خوراک میں چینی وغیرہ بھی استعمال کرتے تھے جو ذیابیطس کے مرض میں بہت نقصان دہ ہے۔ ذیابیطس کے مرض میں وزن کو متوازن رکھنا اور ورزش بہت ضروری ہے جب کہ غالباً گاؤٹ کی وجہ سے ان کے لیے بہت چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات تو طے ہے کہ وہ اپنی وفات تک متحرک اور فعال زندگی بسر کرتے رہے حتیٰ کہ ۲۹ نومبر ۱۹۵۰ء کو بھی حسب معمول کالج گئے۔ سارا دن مختلف مصروفیات میں گزرا (یاد رہے کہ ان دنوں بطور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ان کے تقرر کا کیس زیر غور تھا) واپس آئے تو انہوں نے اپنی بیگم سے سینے میں درد کی شکایت کی۔ بقول مسز تاثیر:

''ڈاکٹر تاثیر نے سینے میں جلن کی شکایت کی تھی'' (جسے انگریزی میں Heart Burn کہا جاتا ہے۔) مسز تاثیر نے انہیں سوڈا بائی کارب لا کر دیا جو ان دنوں سینے کی جلن کے علاج کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور ہاضم ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر تاثیر نے افاقے کا اظہار کیا اور مسز تاثیر سے کہا: ''اب میں بہتر ہوں تم جا کے سو جاؤ۔'' مسز تاثیر اپنے کمرے میں آ گئیں لیکن انہیں چین نہ آیا تھوڑی دیر کے بعد وہ دیکھنے کے لیے گئیں کہ کیا اب آرام ہے اور سو گئے ہیں کہ نہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر تاثیر کی نبض ساکت پائی، پڑھی لکھی عورت تھیں ماتھے پر ہاتھ لگایا آنکھوں کی پتلیوں کو دیکھا اور سمجھ گئیں کہ چراغ گل ہو چکا ہے۔ نہایت حوصلہ مند خاتون تھیں اپنے بچوں کے پاس آئیں اور انہیں کہنے لگیں:

''میرے ساتھ ڈیڈی کے کمرے میں آؤ اور انہیں پیار کر و وہ ہمیں چھوڑ گئے ہیں۔''

اس اثناء میں ڈاکٹر بھیک کو بھی بلوایا گیا جنہوں نے ان کے انتقال کی تصدیق کی۔

جس طرح ڈرامائی طور پر ڈاکٹر تاثیر شہرت کی بلندیوں پر پہنچے تھے اس طرح ڈرامائی طور پر ان کی وفات ہوئی۔ ان کی موت کی خبر تمام اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات پر خصوصی فیچر بھی شائع کیے گئے۔ ان کا جنازہ ان کے مکان واقع میسن روڈ سے اٹھایا گیا جس میں لاہور کے تمام مشاہیر نے شرکت کی۔ جنازے میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔ اسلامیہ کالج کے طلباء کے تو وہ انتہائی ہر دلعزیز استاد اور پرنسپل تھے۔ وہاں ان کی موت کی خبر بجلی بن کر گری۔ جس نے سنا سکتے میں رہ گیا ایک دن پہلے کالج آنے والا فعال متحرک اور جاندار شخص اچانک دنیا چھوڑ گیا کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

ہفت روزہ ''چٹان'' ''رسالہ مخزن'' اور ''نقوش'' کے شماروں میں اس وقت کے جن نامور اہلِ قلم کے تاثرات شائع کیے گئے ان میں مولانا عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، سیّد عابد علی عابد، فیض احمد فیض، سیّد امتیاز علی تاج اور خلیفہ عبدالحکیم شامل تھے۔

ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت

ڈاکٹر تاثیر اور سید عابد علی عابد کی کی طبیعت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ چنانچہ آپس میں بہت دوستی تھی اور اکثر روزانہ ملاقات رہتی۔

ڈاکٹر تاثیر بلند قامت اور وجیہہ انسان تھے بدن ذرا فربہی کی طرف مائل۔ ہنستی ہوئی خوبصورت آنکھیں خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ اکثر پاجامہ کرتا پہن کر آتے، پاؤں میں اکثر وبیشتر دیسی جوتی ہوتی تھی کبھی کبھی تلے والی جوتی جسے بڑی شان سے دکھاتے اور ساتھ جتاتے کہ قیمت بہت کم ہے یعنی انہوں نے بہت اچھا سودا کرلیا ہے۔

ایک مرتبہ جب ان کے لباس اور سلیم شاہی جوتوں کی بہت تعریف ہوئی تو کھڑے ہو گئے اور کہا:

''میں خود کیا کم ہوں''

یہ کہہ کر اٹھے اور کمرے میں ٹہلنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ یہ شعر پڑھتے جاتے:

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

ہمارے ہاں آتے ہی کوئی نہ کوئی کھانے کی فرمائش ضرور کرتے ان کی پسندیدہ غذا عابد صاحب کو بھی بہت مرغوب تھی۔ مثلاً قیمے والے نان پراٹھے۔ مچھلی'' ڈمرہ'' عابد صاحب اکثر ان کے لیے چانپیں بنواتے جو وہ بہت شوق سے کھاتے ہم نے انہیں

چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔البتہ لسی وغیرہ شوق سے پیتے تھے پان کا بھی شوق تھا ایک چاندی کی ڈبیہ ساتھ رکھتے تھے۔شام کے وقت اکثر ان کے بیوی بچے بھی ہمراہ ہوتے حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی گھریلو زندگی قابلِ رشک تھی۔گوان کی بیگم ایک الگ کلچر سے تعلق رکھتی تھیں تاہم دونوں میں مکمل ذہنی ہم آہنگی تھی۔ڈاکٹر صاحب اپنے بچوں کو والہانہ چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوستانہ فضا تھی۔بے تکلفی بھی تھی مگر بچے حدِ ادب سے آگے نہیں جاتے تھے۔بیگم تاثیر ایک مکمل مشرقی خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ان کے خاندان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ دو مختلف تہذیبوں نے مل کر زندگی کو بہت خوبصورت رنگ عطا کیے ہیں۔کبھی کبھی فیض صاحب اور ان کے بیوی بچے بھی ان لوگوں کے ہمراہ ہوتے۔ سب کی آپس میں بہت دوستی تھی۔بہت رونق رہتی۔

ڈاکٹر تاثیر بے حد بلند نظر اور اعلیٰ ظرف انسان تھے علم کی تفہیم میں کبھی خست سے کام نہ لیتے۔انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ کسی کا بھلا کیوں ہو جیسا کہ معاشرے کا چلن ہے ایک مرتبہ عابد صاحب اپنی مشہور غزل:

حدِ افق تک پھیلا ہوا تھا دشتِ غم دل
رُک رُک کے مجھ کو چلنا پڑا تھا منزل بہ منزل

کے سلسلے میں فکرِ سخن کر رہے تھے اور ایک مصرعے پر رکے ہوئے تھے وہ مصرع اس طرح تھا:

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی ....
ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا محمل بہ محمل

یعنی پہلے مصرعے کا دوسرا ٹکڑا نہیں مل رہا تھا اتنے میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے پوچھنے لگے کس فکر میں ہو عابد صاحب نے بتایا کہ اس مصرع پر رکا ہوا ہوں ایک ٹکڑا نہیں سوجھ رہا ڈاکٹر تاثیر نے فی البدیہہ کہا عابد اس مصرع کا اگلا ٹکڑا تو ازل سے متعین ہے۔

''لیلیٰ نہیں تھی''یعنی اب شعر اس طرح ہوگیا:

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی لیلیٰ نہیں تھی
ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا محمل بہ محمل

عابد صاحب اس ٹکڑے کو سن کر پھڑک اٹھے اور ڈاکٹر تاثیر کو گلے لگا لیا یہ واقعہ دو باتیں ظاہر کرتا ہے ایک ڈاکٹر تاثیر کی بلند نظری اور دوسرے ان کی سخن فہمی۔ ڈاکٹر تاثیر انگریزی اردو اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے مگر بنیادی طور پر ان کی شخصیت میں مراجعت پسندی غالب تھی۔ مولانا عبدالمجید سالک انہیں مشرق اور مغرب کے علوم کا حسین امتزاج قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے:

''ڈاکٹر تاثیر ایک ہمہ گیر طبیعت رکھتا تھا۔ انگریزی ادب میں فضیلت کا درجہ رکھنے کے ساتھ مشرقیت میں چُور اور نشۂ فارسی میں مخمور تھا۔''

ڈاکٹر ریاض قدیر اپنے مقالے ''ڈاکٹر تاثیر شخصیت اور فن'' میں ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت کے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر تاثیر کا شمار ان معدودے چند اور کمیاب اشخاص میں ہوتا ہے جو مشرق اور مغرب کے علوم پر بیک وقت عبور رکھتے تھے لہٰذا ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت یک رخی نہیں بلکہ جامع تھی۔ اس میں اعتدال اور توازن پایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر اگرچہ انگریزی ادب میں تعلیم یافتہ انسان تھے حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں مشرقی انداز اور رنگ بہت نمایاں تھا ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور مشرقی تہذیب کی تمام اقدار ان کی شخصیت میں رچ بس

گئی تھیں۔ ان کا طرزِ فکر و احساس رہن سہن، لباس اور رہائش کے
انداز غرضیکہ حیات کے جملہ پہلو مشرقی رنگ کے تھے۔ انہیں اپنے
کلچر اور ثقافت سے بے حد محبت تھی اور اپنے مسلمان اور پاکستانی
ہونے پر فخر تھا۔ انہیں مغربی ادب اور آرٹ کے ساتھ ساتھ مشرقی
ادب اور آرٹ سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ مشرقی موسیقی سے دل بہلاتے
تھے۔ مشرقی فنون سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ خصوصاً مصورِ مشرق
عبدالرحمٰن چغتائی کے آرٹ نے انہیں جنون کی حد تک عشق تھا۔ اسے
متعارف کرانے میں ڈاکٹر تاثیر نے بہت اہم کردار ادا کیا وہ
اکبرالہ آبادی، غالب اور اقبال جیسے مشرقی تہذیب کے نمائندہ شعرا
کے مداح تھے۔''

(ڈاکٹر تاثیر شخصیت اور فن: ڈاکٹر ریاض قدیر)

ڈاکٹر تاثیر کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے چراغ حسن حسرت کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ تو ہمارے ادبی ورثے کا ایک حصہ بن گئی ہے چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر دونوں اپنی جولانی طبع کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ ڈاکٹر محمد سلیم اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں برصغیر کے چند مسلم اہلِ قلم'' میں لکھتے ہیں:

'' ڈاکٹر تاثیر ایک کثیر الجہات شخصیت تھے ایک اچھے شاعر اور سخن فہم اور ادب کے اہم نقاد قدیم اور جدید مصوری کے باکمال پارکھ، اردو انگریزی اور فارسی زبانوں اور لٹریچر پر حاوی اچھے مقرر اسلامی تاریخ سے بخوبی آشنا اور انتظامی امور میں بے نظیر۔ ذہین، بذلہ سنج اور محفل آرا۔ تیزی طبع میں ان کا ثانی نہ تھا ادبی سیاسی اور ذاتی چھیڑ چھاڑ اور ہنگامہ پروری ان کی ہابی تھا کبھی اس سے الجھتے کبھی اس سے چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔''

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''لڑنے پر آتے تو ساری حدود پھلانگ جاتے کبھی جیت جاتے کبھی
چاروں شانے چت ہو جاتے لیکن مخالفت کی شدت میں کسی کے
روادار نہ تھے''

(ڈاکٹر تاثیر۔ بیسویں صدی میں برصغیر کے چند مسلم اہلِ قلم۔ ڈاکٹر محمد سلیم)

ڈاکٹر سلیم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر تاثیر کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو اگرچہ سب نے تسلیم کیا ہے
مگر نظم وضبط نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اہم نثری کام نہ کر سکے۔''

مجھے ڈاکٹر سلیم کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ممتاز اختر مرزا کی مرتب کردہ ''مقالاتِ تاثیر'' تقریباً سات سو صفحات کی کتاب ہے جس میں ڈاکٹر تاثیر کے ۹۸ مضامین اور مقالے شامل ہیں۔ ان مقالوں اور مضامین کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ انسان دیکھا کرے۔ اگر ڈاکٹر تاثیر اس کے علاوہ اور کوئی نثری کام نہ ہی کرتے تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ نظم وضبط کے فقدان کی وجہ سے کوئی اہم نثری کام نہ کر سکے علاوہ ازیں ان کی ایک مشہور کتاب اقبال کا فکر وفن ہے جس میں فن اور فکر اقبال پر مضامین ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ یعنی پچاس برس سے کم عمر میں اگر دیکھا جائے تو جو زندگی بھر انہوں نے پڑھا لکھا تھا اس پر لکھنے لکھانے کا وقت تو اب آیا تھا ابھی تک تو وہ اپنا زادِ راہ سمیٹ رہے تھے۔ انہیں یکسوئی سے کام کرنے کا تو موقع ہی نہیں ملا۔ ڈاکٹر تاثیر کے ذہن میں یہ خیال تھوڑا تھا کہ موت ان کا رشتۂ زندگی پچاس سال پر منقطع کر دے گی سوچتے ہوں گے ابھی عمر پڑی ہے سب کچھ لکھیں گے۔

جیسا کہ میں نے اپنے مشاہدے کی بنا پر تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نہایت اعلیٰ ظرف آدمی تھے اور دوستوں کی طرف ان کا رویہ انتہائی فیاضانہ تھا۔ ان میں اتنی خوداعتمادی تھی کہ وہ بلاتکلف اچھے شعر اور فن پارے کی تعریف کر دیتے۔ یہ کبھی خیال نہ کرتے کہ یہ شاعر یا ادیب کہیں مجھ سے بڑا مقام حاصل نہ کر جائے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ کسی کی تعریف کرتے وقت انہوں نے پیشہ وارانہ رقابت کو کبھی آڑے نہیں آنے دیا۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اچھے شعر اور اچھے فن پارے کو جس قدر ہو سکے عام کیا جائے اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد سلیم لکھتے ہیں:

''عبدالرحمٰن چغتائی کی شہرت کو دوستوں کی محفل سے نکال کر عوام تک لانے میں محمد دین ڈاکٹر تاثیر اور ماہنامہ نیرنگِ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ حکیم یوسف حسن خان نے ۱۹۲۴ء میں اس رسالے کا آغاز کیا اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد باقاعدگی سے ان کی تخلیقات نیرنگِ خیال میں آنے لگیں۔ اسکے ساتھ ساتھ ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کے بارے میں اور مصوری کے فن اور تکنیک کے سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر کے مضامین اور وضاحتی نوٹ بھی شائع ہونے لگے۔''

مالک رام لکھتے ہیں:

''بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ڈاکٹر تاثیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے کے لیے اور اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کی خاطر اور دوسرے عالمی مصوروں کے مقابلے میں ان کی امتیازی خصوصیات کو سامنے لانے کے لیے یورپ کے بڑے بڑے مصوروں اور فنون

لطیفہ کے حامدین تخلیقات اور تصنیفات کا بغائر مطالعہ کیا۔
نیرنگِ خیال کے ہر خاص نمبر میں چغتائی کی بنائی ہوئی دو تین رنگ
دار تصویریں ہوتی تھیں جن کے ساتھ ڈاکٹر تاثیر کے وضاحتی نوٹ
ہوتے تھے یہ سلسلہ کئی برس تک چلتا رہا۔ جب رسالہ کارواں نکلا تو
اس میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔''

(ڈاکٹر تاثیر شخصیت اور فن: ڈاکٹر محمد سلیم)

جب ۱۹۲۸ء میں دیوانِ غالب مرقع چغتائی شائع ہوا تو عبدالرحمٰن چغتائی کی شہرت
چار دانگ عالم میں پھیل گئی لیکن اس کتاب میں ڈاکٹر تاثیر کی ان جاں گزار کاوشوں کا
ذکر نہیں ہے۔ جن کے بغیر چغتائی کو وہ غیر فانی شہرت نصیب نہ ہو سکتی تھی۔

غلام عباس اس سلسلے میں بتاتے ہیں:

''ڈاکٹر تاثیر نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا اور مسکرا کر بات ٹال دی۔''

یہ تھا ڈاکٹر تاثیر کا ظرف اور یہ تھا طریقہ دوستوں کی امداد کرنے کا۔ یہ سب کچھ انہوں
نے اپنی ذات سے بلند ہو کر کیا اور کبھی یہ نہ سوچا کہ اس سے انہیں کوئی ذاتی شہرت ملتی
ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کی بے وقت موت نے ان کے ادبی سفر کو منقطع کر دیا جیسا کہ میں نے پہلے
تحریر کیا ہے کہ ابھی تو ابتدا تھی اگر زندگی انہیں مہلت دیتی تو خدا جانے آسمان علم کا یہ
صف النہار آفتاب شہرت کی کون سی بلندیوں پر جا پہنچتا۔ اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے
میں فقط یہی لکھ سکتی ہوں کہ

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر تاثیر کی قائداعظمؒ سے ملاقات

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ سے ڈاکٹر تاثیر کو تین بار بالمشافہ ملنے کا شرف حاصل ہوا جب کہ ایک بار ٹیلی فون پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ قائداعظمؒ سے ڈاکٹر تاثیر کی پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب ڈاکٹر تاثیر اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تاثیر بین الاقوامی سیاسیات کا شعور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور آزادی پسند ہندوستانی طلباء کے حلقے میں باقاعدہ شامل ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اس زمانے میں آزادی ہند کے لیے تمام جماعتوں کے اتحاد کے حامی تھے۔ اس سلسلے میں وہ محمد علی جناح کے خیالات جاننے کے مشتاق تھے۔ ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں:

> ''۱۹۳۵ء میں کیمبرج کے کچھ مسلمان طلباء مسٹر محمد علی جناح سے ملنے کے لیے لندن آئے میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم لوگ انگریزی استبداد کے ہٹانے کے لیے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ بنانے کے حق میں تھے۔''

جناح کو اس سے نظریاتی اتفاق تھا لیکن وہ کہنے لگے:

> ''ہندو اتحاد کو محض اپنی برتری کے لیے چاہتے ہیں۔ گاندھی کٹر ہندو ہے گو وہ بڑی میٹھی میٹھی صلح کن باتیں کرتا ہے اور نہرو کی بین الاقوامی

طرزِ گفتگو محض سطحی ہے۔ مسلمانوں کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے
کہ وہ متفق ہو کر انگریزی استبداد کے خلاف جدوجہد کریں۔ انگریز
سے بچ کر ہندو کے چنگل میں پھنسنا پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگا۔"

یہ بڑی پیش پا افتادہ باتیں تھیں لیکن جناح نے انہیں کچھ اس یقین سے کہا کہ ہم سب پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور آ کر میں نے علامہ اقبالؒ سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے:

"جناح مردِ مستقبل ہے۔ مسلمانوں میں فقط وہی صاحبِ دیانت
لیڈر ہے۔ کاش اس میں عوامی رہنما بننے کی صلاحیت پیدا ہو"

اس ملاقات میں قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیتوں کا نقش ڈاکٹر تاثیر کے دل و دماغ پر ثبت ہو گیا اور اقبال کی زبانی قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کی تصدیق نے اس نقش کو اور گہرا کر دیا اور ڈاکٹر تاثیر، قائداعظم محمد علی جناحؒ کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح سے ڈاکٹر تاثیر کی دوسری ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی جب ڈاکٹر تاثیر دہلی میں حکومت ہند کے پبلسٹی محکمہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس دور میں ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد تحریک پاکستان اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمان قائداعظم کو اپنا رہنما مان چکے تھے۔ قائداعظمؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قومی و بین الاقوامی مسائل کو سلجھانے میں صرف ہونے لگا۔ ان کی مصروفیات ہمہ وقت اور گوناگوں تھیں۔ تاہم انہوں نے ڈاکٹر تاثیر کو پہچان لیا۔ اس ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر کہتے ہیں:

"جب میں نے دوسری دفعہ انہیں دیکھا تو وہ لندن والے مسٹر جناح

نہیں تھے بلکہ قائداعظمؒ تھے۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں نے ان
سے ۱۹۳۵ء کی ملاقات کا ذکر کیا تو انہیں وہ واقعہ یاد تھا اور جب ان کا
کہا ہوا دہرایا۔"
تو فرمانے لگے:
"ہندوستان جبھی آزاد ہو گا کہ مسلمان آزاد ہوں اور مسلمانوں کی
آزادی پاکستان کے بغیر ناممکن ہے"۔

ڈاکٹر تاثیر کی قائداعظم سے تیسری اور آخری ملاقات ۱۹۴۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کو ۱۹۴۶ء میں قیام دہلی کے دوران قائداعظم سے ٹیلیفون پر گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا جس میں قائداعظم نے ڈاکٹر تاثیر کو صحت کی دعا دی کیونکہ ڈاکٹر تاثیر ان دنوں صحت خراب ہونے کے باعث حسب پروگرام قائداعظم سے ملنے کے لیے حاضر نہ ہو سکے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹر تاثیر نے قائداعظم کو فون کیا۔ ڈاکٹر تاثیر بیان کرتے ہیں کہ:

"تیسری دفعہ میں نے ان کی آواز ٹیلیفون پر سنی۔ یہ بھی دہلی کا واقعہ
ہے مجھے دس بجے صبح ان سے ملنا تھا کہ اچانک میری طبعیت خراب
ہو گئی۔ چنانچہ میں نے آٹھ بجے ان کے گھر پر فون کیا۔ میں نے پہلے
نہیں پہچانا کہ وہ خود بول رہے ہیں یا نہیں۔ بڑی ملائم آواز میں کہنے
لگے "خدا آپ کو شفا دے۔"

ان تمام ملاقاتوں میں ڈاکٹر تاثیر کو قائداعظم کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے اور وہ قائداعظم میں پائے جانے والے سطوت، دردمندی، اخلاص، دیانت، حالات کا معروضی تجزیہ کرنے کی صلاحیت، قومی سوچ، قوت فیصلہ اور حسن اخلاق جیسے اوصاف سے بے حد متاثر ہوئے۔ جس کا اظہار ڈاکٹر تاثیر نے اپنے مضمون

''ہائے وہ میر کارواں نہ رہا'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ قائداعظم سے انہی ملاقاتوں کے نتیجے میں ڈاکٹر تاثیر کے سیاسی عقائد ونظریات میں تبدیلی واقع ہوئی اور وہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں قائد کے ہم نوا ہو گئے۔

ڈاکٹر تاثیر کی شعبہ تعلیم میں خدمات

ایم۔اے۔او کالج میں ملازمت

انگلستان سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد یہ بات بالکل فطری معلوم ہوتی تھی کہ کٹر تاثیر کا تقرر، اسلامیہ کالج، لاہور میں ہوتا۔ کیونکہ وہ کیمبرج روانگی تک بطور لیکچرار انگریزی'' اسلامیہ کالج میں تعینات تھے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر تاثیر، پل ہو کر ایم۔اے۔او کالج، امرتسر چلے گئے۔

اس سلسلے میں میاں امیر الدین فرماتے ہیں:

> ''کالج کمیٹی تو ڈاکٹر تاثیر کو بطور پروفیسر کے اسلامیہ کالج، لاہور میں رکھنا چاہتی تھی مگر میں نے ان کے اشتراکی نظریات کی وجہ سے اس کی ممانعت کی۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ڈاکٹر تاثیر کے نظریات اور کوئی بھی ہوں اشتراکی ہرگز نہ تھے مگر وہ دن ایسے تھے کہ نوکری نہ دینے کے لیے اشتراکیت کا الزام ہی کافی تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے ڈاکٹر تاثیر کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ خصوصاً جب وہ عنقریب شادی کرنے والے تھے چنانچہ ان کی تعیناتی ایم اے او کالج امرتسر میں بطور پرنسپل کے ہوگئی۔ اسلامیہ کالج، لاہور میں تو ڈاکٹر تاثیر پروفیسر ہی ہوتے۔ ایم۔اے او کالج، امرتسر چونکہ

نسبتاً چھوٹا کالج تھا اس لیے ڈاکٹر تاثیر کی تقرری براہ راست بطور
پرنسپل کے ہوگئی۔"

ان کی تقرری کو بطور پرنسپل مختلف اخبار اور رسائل میں بہت سراہا گیا۔اور ایم اے او کالج، امرتسر کے لیے ایک نیک شگون قرار دیا۔امرتسر اور ان کے گردونواح میں ایم۔اے او کالج مسلمانوں کے لیے اگر چہ واحد درسگاہ تھی مگر طلباء کی تعداد نسبتاً محدود تھی۔ ڈاکٹر تاثیر کے آنے کے بعد ایک برس میں یہ تعداد ڈیڑھ گنا ہوگئی۔انہوں نے اپنی خصوصی کوششوں سے کالج کے لیے سرکاری گرانٹ کا بندوبست بھی کیا۔ایک نئی عمارت کی تعمیر کی داغ بیل بھی ڈالی۔ڈاکٹر تاثیر چونکہ کیمبرج میں تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اس لیے وہاں کی ہر بات سے خوب واقف تھے۔انہوں نے کوشش کی کہ اس کالج میں بھی جدید طریقہ تعلیم رائج کیا جائے۔

ڈاکٹر تاثیر کے آنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ ایم اے او کالج میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جلسۂ تقسیم اسناد میں مہمانِ خصوصی تھے۔امرتسر میں اتنی جاندار اور زبردست شہرت کی حامل شخصیات کو اکٹھا کر لینا ڈاکٹر تاثیر ہی کا کمال تھا۔پرنسپل کا عہدہ بنیادی طور پر ایک انتظامی نوعیت کا ہوتا ہے چنانچہ اگر کالج کا پرنسپل اپنے آپ کو درس وتدریس سے الگ بھی رکھتے تو کام چل جاتا مگر یہ بات ڈاکٹر تاثیر کے مزاج کے خلاف تھی کہ وہ خود طلباء کو نہ پڑھائیں چنانچہ بی اے کی کلاسز کو ڈاکٹر تاثیر انگلش پوئٹری خود پڑھاتے۔

غیر تدریسی سرگرمیاں طلباء کی شخصیت کی تعمیر میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کے بطور پرنسپل کے دور میں کالج یونین کے زیرِ انتظام مباحثوں اور مشاعروں

کا اہتمام بھی کیا گیا جس سے ایک طرف تو طلباء کی جوان توانائیوں کے تصرف کے لیے ایک معتبر راستہ تلاش کر لیا گیا دوسری طرف صوبہ بھر میں کالج کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ غرضیکہ ڈاکٹر تاثیر کی بطور پرنسپل تعیناتی کے پانچ برس ایم اے او کالج امرتسر کے لیے بادِ نسیم کا جاں فزا جھونکا تھا۔ جس سے کالج تو ایک طرف سارا چمنستانِ امرتسر مہک اٹھا۔

مختلف شواہد سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کی تعیناتی کو بہت سراہا گیا۔ باقی مضامین کا تو علم نہیں لیکن انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری سوائے ڈاکٹر تاثیر کے ان دنوں کسی کے پاس نہ تھی۔

ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ امرتسر عمومی طور اور ایم اے او کالج خصوصاً اہلِ علم اور شعراء کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کی طبیعت کا یہ خاصہ تھا کہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کو یکساں اہمیت دیتے۔ یہ بات وہ غالباً کیمبرج یونیورسٹی سے سیکھ کر آئے تھے کہ خالی نصابی سرگرمیوں سے طلباء کی شخصیت میں نکھار نہیں آتا چنانچہ انہوں نے آتے ہی مشاعرے منعقد کرنا شروع کیے۔ جن میں اس زمانے کے مشہور شعراء حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، صوفی تبسم اور چراغ حسن حسرت حصہ لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر صدیق کلیم جو بعد میں پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور ہوئے بی۔ اے میں ڈاکٹر تاثیر کے چہیتے شاگرد تھے۔ انہوں نے ''الہلال'' کے اردو حصہ کی ادارت سنبھالی اور ''کالج میگزین'' پورے آب و تاب کے ساتھ شائع ہونا شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس زمانے میں پورے یورپ پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہندوستان چونکہ انگلستان کا مقبوضہ علاقہ تھا اس لیے جنگ کا اس ملک پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔ اپنی ہمہ جہت شخصیت کے ذریعے ڈاکٹر تاثیر نے کالج کے ماحول میں خصوصاً اور شہر میں عموماً ایسی رجائیت پیدا کر دی

کہ ایسا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ دنیا جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ لاہور کے مقابلے میں بہت چھوٹا شہر ہونے کی حیثیت سے اور پھر لاہور کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے امرتسر میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو مہمیز کرنا بہت دشوار کام تھا مگر ڈاکٹر تاثیر ان لوگوں میں سے تھے جو مشکل سے مشکل کام اس آسانی سے کر جاتے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی۔ سینٹ جان پرس کو شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے اسی طرح ڈاکٹر تاثیر استادوں کے استاد تھے۔

ایم اے او کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں اور امرتسر کی ثقافتی زندگی میں علامہ اقبالؒ کا کہیں ذکر نہیں آتا حالانکہ علامہ، نوجوانوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ڈاکٹر تاثیر سے تو بہت ہی شفقت فرماتے تھے۔ اس کی وجہ سمجھنا نہایت آسان ہے جب ڈاکٹر تاثیر امرتسر آئے تو علامہ کی صحت بہت گر چکی تھی۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ سب محفل علامہ ہی کی سجائی ہوئی تھی جس کے شرکاء امرتسر کے ثقافتی ماحول کو چار چاند لگا رہے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی پوری کی پوری کھیپ کسی نہ کسی طرح علامہ ہی کی تربیت یافتہ تھی اور ڈاکٹر تاثیر کی تعلیم و تربیت میں تو علامہ نے خصوصی دلچسپی لی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر تاثیر ۱۹۴۱ء تک امرتسر رہے۔ یہ دو سال بہت اہمیت کے حامل تھے کیونکہ جنگ کی خبریں اتحادیوں کے لیے بہت حوصلہ شکن تھیں۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر تاثیر نے ریڈیو پروگرام بھی منظم کیے اور ان کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں امید کی کرن روشن کی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک پانچ برس ڈاکٹر تاثیر کی ذات ایک ایسی انجمن تھی جس نے امرتسر کے ادبی اور ثقافتی ماحول کو چار چاند لگا دیئے۔ مختلف کالجوں کے سالانہ مباحثوں میں ایم۔ اے او کالج، امرتسر کے مقرروں کا طوطی بولتا تھا حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے مباحثے میں بھی ایم۔ اے او کالج نے ادبی انعام حاصل کیا۔ یہ سلسلہ ڈاکٹر تاثیر کے جانے تک بہت کامیابی سے چلتا رہا۔

ڈاکٹر تاثیر نے ایم اے او کالج چھوڑ کر بطور پرنسپل سری پرتاب کالج، سری نگر جانا کیوں پسند کیا اس کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔ اس کی اغلب وجہ یہ ہے کہ ایک تو بطور پرنسپل ان کی تعیناتی کو ایم اے او کالج امرتسر میں پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ ڈاکٹر تاثیر کے خلاف ایم اے او کالج امرتسر میں کوئی محاذ صف آراء تھا مگر ان کی دور بین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اب درسگاہ بدلنے کا وقت آ گیا ہے پیشتر اس کے کہ کوئی تنازع سر اٹھائے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد کر لیں تو بہتر ہے۔ دوسری وجہ جو ہو سکتی ہے وہ کشمیر کا موسم اور مقامی ماحول ہے۔

پرنسپل سری پرتاب کالج، سری نگر

۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر تاثیر کی تعیناتی بطور پرنسپل سری پرتاب کالج، سری نگر ہوئی۔ چونکہ ڈاکٹر تاثیر کی تقرری ایک ہندو پرنسپل کی جگہ ہوئی تھی اور کالج کے طلباء کی اکثریت ہندو تھی اس لیے غیر مسلم حلقوں کی جانب سے احتجاج عین متوقع تھا مگر مقامی مسلمانوں اور خصوصاً شیخ عبداللہ کی بروقت کوششوں سے یہ احتجاج اتنا مؤثر ثابت نہ ہوا اور ڈاکٹر تاثیر نے بغیر کسی مزاحمت کے کالج کے پرنسپل کے طور پر چارج لے لیا۔ مسلمان طلباء ہندوستان میں عموماً اور کشمیر میں خصوصاً ہندوؤں کے مقابلے میں بہت اقلیت میں تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور صرف میٹرک کر کے کلرکی نہ کرتے رہیں۔

ڈاکٹر تاثیر اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ایک برس کے عرصے میں ڈاکٹر تاثیر کی پالیسیوں میں تعصب نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے مقامی ہندوؤں نے انہیں پوری طرح قبول کر لیا کیونکہ وہی لوگ جو ڈاکٹر تاثیر کے سری پرتاب کالج میں آنے پر شور مچا

رہے تھے آسانی سے انہیں ڈگری کالج کے پرنسپل کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس میں جہاں ڈاکٹر تاثیر کے کردار اور ذاتی قابلیت کا بہت بڑا حصہ ہے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مقامی ہندو اور مسلم لیڈر شپ جو ہر شناس تھی اسے کھرے کھوٹے کی پہچان تھی وہ سمجھ گئے تھے کہ انہیں کالج کے لیے صحیح آدمی مل گیا ہے۔

امرتسر کے گرم موسم کے مقابلے میں سری نگر ایک نہایت پر فضا مقام تھا۔ ڈاکٹر تاثیر ایک ماہر منتظم تھے ان کے بطور پرنسپل، ملازمت کے دوران کالج میں طلباء کی تعداد میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا خصوصاً مسلمان طبقے سے طلباء جوق در جوق کالج میں داخل ہونا شروع ہو گئے سری پرتاب کالج، سری نگر کا بہت بڑا کالج تھا ڈاکٹر تاثیر کی توجہ اور کوششوں سے طلباء کی تعداد اور بھی زیادہ ہوگئی حتیٰ کہ ڈگری کلاسز کے لیے ایک علیحدہ کالج قائم کرنا پڑا جو، بعد میں ''امر سنگھ ڈگری کالج'' کہلایا۔

ڈاکٹر تاثیر کی سیماب صفت طبیعت نے کالج کی تعلیمی سرگرمیوں کو بی اے تک محدود رکھنا منظور نہ کیا اور وہاں ایم اے انگریزی کی کلاسز کا اجراء کیا اس طرح پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کلاسز کی بھی ابتدا کی۔

ڈاکٹر تاثیر نے ایف سی کالج، لاہور اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے وہ غیر تدریسی سرگرمیوں کے ثمرات سے بخوبی آگاہ تھے انہیں یہ علم تھا کہ طلباء کو محض کتاب کا کیڑا بنانے سے ان شخصیت کی صحیح تعمیر نہیں ہوتی چنانچہ ان کی بطور پرنسپل تعیناتی کے دور میں جہاں بے شمار مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوئیں وہاں کالج کے میگزین ''لالہ رُخ'' کو بھی نئے انداز سے شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر تاثیر کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ کالج میں ''اردو سبھا'' کا قیام تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ انجمن اُردو کی ترویج اور ترقی کے لیے قائم کی گئی مگر اس میں ڈاکٹر تاثیر کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ''سبھا'' کا لفظ استعمال کر

ے اس انجمن کو ہندو طبقے کے لیے بھی قابل قبول بنا دیا۔
کشمیر میں شخصی حکومت کی وجہ سے بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور پسماندہ طبقے کا
ت استحصال ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنی فہم و فراست سے شخصی حکومت سے کالج کو
صل ہونے والے فوائد کی طرف اپنی توجہ رکھی اسی لیے وہ ایک ڈگری کالج کے قیام میں
ں کامیاب ہوئے۔ علاوہ ازیں غریب طلباء کے لیے وظائف اور ان کی اقامتی سہولتیں
یا کرنے کے لیے بھی مالی وسائل کی ضرورت تھی۔ جو انہیں حالات میں آسانی سے حاصل
سکتے تھے۔ وگرنہ سرکار کے سرخ فیتے کے لمبے چکر میں دو سال کے قلیل عرصہ میں کوئی
بل ذکر کامیابی حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگری راج کا استحصالی
ام ڈاکٹر تاثیر کے مزاج کو موافق نہ تھا باوجود اس کے کہ انہیں کشمیر میں بے شمار سہولتیں
یا تھیں لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر تاثیر، سری نگر میں اپنے قیام سے خوش نہ تھے۔ مسز تاثیر
ھتی ہیں:

''کشمیر میں ان کی ملازمت کا انداز بالکل مختلف تھا۔ کالج کے ملازمین بشمول پرنسپل کو اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بڑے افسروں کے پاس دربار داری کے لیے جانا پڑتا تھا اور ظاہر ہے کہ وہاں خوشامد کا اور چاپلوسی کا ماحول ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ مہاراجہ بھی اپنا دربار منعقد کرتے تھے جس میں سرکاری افسروں کو جانا پڑتا۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر تاثیر کی آزاد منش طبیعت کے منافی تھا۔''

ڈاکٹر تاثیر نے کشمیر جیسے پر فضا مقام کو چھوڑ کر دلی بطور ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر جانے کی وجہ بھی
ی ہوگی۔ اس سوال کا جواب بھی مسز تاثیر کے مضمون میں مل جاتا ہے۔
''اصل میں ڈاکٹر تاثیر کشمیر کے ڈوگرہ راج کی استحصالی فضا سے تنگ آ

گئے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں چھ سو ریاستیں تھیں اور ہر جگہ یہی حال تھا۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں میں تو حالات بدترین تھے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو انگریزی حکومت کی فضا ریاستوں کے مقابلے میں بہت آزاد تھی سوائے ان معاملات کے جہاں انگریز کے مفاد پر زد پڑتی ہو۔ قانون کی عملداری تھی۔ انگریز کم از کم مقامی آبادی کے درمیان مکمل انصاف کرتا تھا یہ بات کشمیر میں دیگر تمام ریاستوں کی طرح مختلف تھی۔ اگر یہ معاملہ خالی عوام تک محدود ہوتا تو شاید کچھ عرصہ گزارا جا سکتا تھا مگر یہ بات خارج از امکان نہ تھی کہ کسی وقت حاکم وقت کا نزلہ کالج پر گر جائے اور پرنسپل بھی اس کی زد میں آ جائے خصوصاً جب پرنسپل مسلمان تھا اور مقامی ہندو طبقے میں مخالفانہ جذبات موجود تھے۔ اغلباً یہی وہ حالات تھے جنہوں نے ڈاکٹر تاثیر کو کشمیر جیسے پُر فضا مقام کو چھوڑنے اور دلّی میں سرکاری محکمے میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔''

دیگر مختلف ملازمتیں

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر تاثیر امر سنگھ ڈگری کالج، سری نگر (سری پرتاب کالج، سری نگر) چھوڑ کر محکمہ محنت میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر کی یادداشت یا خطوط سے اس اجمال کی تفصیل ظاہر نہیں ہوتی جس کی بنا پر ڈاکٹر تاثیر نے اپنا محبوب محکمہ چھوڑ کر ایک بالکل غیر متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت اختیار کر لی نہ صرف یہ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد وزارت اطلاعات میں بھی کام کرنے لگے۔ اس صورت حال کی کوئی توضیح نظر نہیں آتی

سوائے اس کے کہ یہ جنگ کا زمانہ تھا اور تعیناتیوں کا تعلق جنگی ضروریات سے تھا۔ ان کی اس تعیناتی کو دیگر حالات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا اس وقت کے اہلِ علم اور ادیب حضرات جنگی ضروریات کے پیشِ نظر اپنا کام چھوڑ کر فوج کے پبلسٹی کے محکمے میں بھرتی ہو گئے تھے۔ چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، مجید ملک، حفیظ جالندھری سب کے سب کسی نہ کسی شکل میں جنگی ضروریات کے تحت اپنے کام چھوڑ کر مختلف محکموں میں آ گئے تھے۔ اپنی مصروفیات کے باوصف ڈاکٹر تاثیر علمی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر تاثیر دہلی چھوڑ کر لاہور چلے آئے۔ تقسیم ہند سے ذرا قبل اس دوران انہیں کشمیر بھی بھیجا گیا تا کہ پاکستان کے مؤقف پر شیخ عبداللہ کو قائل کر سکیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ ڈاکٹر تاثیر چونکہ لیبر یا اطلاعات کے محکمہ کے باقاعدہ ملازم تو تھے نہیں اور اغلباً معاہدے کے تحت ان محکموں میں کام کر رہے تھے اس لیے وہ کبھی بھی باقاعدہ سرکاری ملازم نہ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے پاس کوئی ملازمت نہ تھی۔ افراتفری کا زمانہ تھا۔ ایک آدھ چھوٹے موٹے کاروبار میں ہاتھ ڈالا مگر کامیابی نہ ہوئی چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء تک ڈاکٹر تاثیر لاہور میں بغیر کسی کام کے تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی دکن میں بھی، ڈاکٹر تاثیر کی ملازمت کی بات چیت ایک زمانے میں چل رہی تھی جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی ڈاکٹر تاثیر کے ذاتی فیصلے کو دخل تھا۔

سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے کشمیر آنا کیوں قبول کر لیا؟ حیدرآباد دکن اور کشمیر میں ایک بنیادی فرق تھا وہاں ایک مسلمان حکومت تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی، جہاں ذریعہ تعلیم اُردو تھا، اپنے وقت کی بہترین درسگاہوں میں شامل تھی۔ اُردو کی ترویج اور ترقی کے لیے تمام وسائل

بروئے کار لائے جارہے تھے۔ نظام دکن بڑے علم اور ادیب نواز تھے۔

لیکن اگر ڈاکٹر تاثیر عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک ہو جاتے تو انہیں ایک اور شخصی حکومت کی خرابیوں سے تو ایسے ہی سابقہ پڑتا جیسے کشمیر میں معاملہ تھا مگر وہ علم و ادب کی ترویج کے لیے وہ کردار نہ ادا کر سکتے تھے جو انہوں نے کشمیر میں کیا کیونکہ دکن میں تو پہلے ہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ کشمیر کو عثمانیہ یونیورسٹی پر ترجیح دینے کی غالباً یہی وجہ تھی۔

پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور

۱۹۴۸ء میں جب عمر حیات ملک، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو ڈاکٹر تاثیر کا انتخاب بطور پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور ہوا۔ اسلامیہ کالج کا انتظام و انصرام انجمن حمایت اسلام کے پاس تھا۔ ۱۹۴۸ء کے پر آشوب زمانے میں حالات ایسے دگرگوں تھے کہ یاروں نے عشق فراموش کر دیے تھے۔ تعلیم کی طرف تو توجہ کیا ہوتی۔ لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ امتحان تو اگلے سال بھی دیا جا سکتا ہے۔ ملک پر ایسے وقت روز روز نہیں آتے۔ چنانچہ اساتذہ اور طلباء نوزائیدہ مملکت کی بقا کی جنگ میں مصروف تھے۔ پڑھنے پڑھانے کی فرصت کسے تھی۔ یہی حال دوسرے کالجوں کا تھا، خصوصاً دیال سنگھ کالج کا جس کے زیادہ تر طلباء تو ہندو سکھ تھے جو تقسیم ہند کے بعد لاہور سے چلے گئے۔ کالج میں اساتذہ رہے اور نہ طلباء۔ اسلامیہ کالج کا حال تو اس لحاظ سے اور بھی بُرا تھا کہ اس کو تو انجمن حمایت اسلام چلا رہی تھی جس کی مالی حالت ان دنوں بوجوہ دگرگوں تھی۔ جس نسل نے بحران کا وہ دور دیکھا ہے انہیں اس کا اندازہ ہوگا کہ کسی کو علم ہی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ہندو اور سکھ، جو، ان علاقوں کو چھوڑ کر گئے تھے جو اب پاکستان میں ہیں اپنے مکانوں کو تالے لگا کر اور ساز و سامان کو بند کر کے اس خیال سے گئے تھے کہ یہ سب عارضی ہے جوں ہی گرد بیٹھے گی

ب ٹھیک ہو جائے گا لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ جائیں گے۔ یہی خیال ان مسلمانوں کا
ھا جو ہندوستان میں شامل ہونے والے علاقے چھوڑ کر آئے تھے اکثر تو اپنا ساز و سامان
نت کے طور پر کسی کے سپرد کر کے آئے تھے یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ
ک اپنے مکانوں کو وطن میں آخری بار دیکھ رہے ہیں۔

یہ وہ حالات تھے جن میں ڈاکٹر تاثیر نے بطور پرنسپل اسلامیہ کالج اپنا منصب سنبھالا ان
کے سامنے گوناگوں مسائل تھے۔ اسلامیہ کالج اگرچہ بنیادی طور پر متوسط مسلمان طبقے کا
لج تھا مگر ۱۹۴۸ء میں تو اس کی پوزیشن اور بھی بگڑ گئی کیونکہ سرحد پار سے آنے والے طلباء
کے پاس تو پہننے کے لیے کپڑے تک نہ تھے۔ فیس کہاں سے دیتے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ان
لات کے سامنے سپر نہ ڈالی اور اپنی طبع کے مطابق ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈٹ گئے
ہے ایسے ہی حالات میں کھرے کھوٹے کا پتہ چلتا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے کی سیاسی فضا بالکل مختلف تھی تب مسلمان قوم کی جدوجہد ایک
آبادیاتی نظام سے چھٹکارا پانے پر مرکوز تھی۔ طلباء کو اس بات پر قائل کیا جا رہا تھا کہ تعلیم تو
یک سال بعد بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ امتحان پھر بھی دیا جا سکتا ہے مگر جدوجہد آزادی
یسے مواقع قوموں کی زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ آزادی کے بعد صورت حال یکسر تبدیل
گئی اب ایک قوم کے منتشر افراد کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرونا مقصود تھا۔
رحد پار سے آنے والے فسادات کے پل صراط سے گزر کر آئے تھے آگ اور خون کا جو
ھیل انہوں نے دیکھا تھا اس سے بڑے زوردار مگر منفی جذبات ایک پوری نسل میں پیدا ہو
یے تھے نوجوان نسل خصوصاً زبردست متاثر ہوئی تھی جنہوں نے اپنے سامنے اپنے عزیزوں
موت کے گھاٹ اترتے اور رشتہ دار اور عزیز و اقارب کے خاندان کی عورتوں کو اغوا
تے دیکھا تھا۔ اب سوال صرف تعلیم کا نہیں تھا بلکہ قوم کی شیرازہ بندی کا تھا۔ ایسی قوم کی

شیرازہ بندی کا جس کے لاکھوں افراد اپنا گھر بار لٹا کر ایک اجنبی زمین میں آ گئے تھے۔ جہاں ان کے پاس نہ کوئی سر چھپانے کا ٹھکانا تھا اور نہ کوئی ذریعہ آمدنی۔ ادھر مہاجر کیمپوں میں ہزاروں بے سروسامان لوگ بکھرے پڑے تھے۔ جن کے لیے ضروریات زندگی مہیا کرنا حکومت کے اکیلے بس کا روگ نہ تھا۔ اب درسگاہوں کے نگرانوں کے لیے دہری ذمہ داری تھی۔ ایک طرف ذہنی طور پر انتشار کے شکار نوجوانوں کو حصولِ تعلیم کی طرف مائل کرنا اور دوسرے انہیں تعمیر نو کے کام پر لگانا۔ اسلامیہ کالج کے طلباء نے اپنی ذمہ داری بطریق احسن نبھائی ایک طرف حصولِ تعلیم کو اپنی لگن اور اپنا مقصد بنایا اور دوسری طرف اجڑے ہوئے بہن بھائیوں اور بزرگوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کالج کی مالی حالت دگرگوں تھی انجمن حمایت اسلام جو کالج کا نگران ادارہ تھا خود مالی بحران کا شکار تھا۔ ان حالات میں ڈاکٹر تاثیر نے کالج کے لیے گرانٹ میں اضافہ کروایا۔ مستحق طلباء کے لیے وضائف کا بندوبست کیا سرکار نے جو رقم مستحق طلباء کے لیے عنایت کی اس سے زیادہ رقم کالج کی طرف سے اس مد میں رکھی گئی اس زمانے میں فیس بہت کم تھی اور دیگر اخراجات بھی آج کے مقابلے میں بہت قلیل تھے پھر بھی ہزاروں روپے اس مد میں خرچ کیے گئے۔

سب سے بڑا مسئلہ انجمن کے نگران حضرات کو اس بات کا احساس دلانا تھا کہ کالج پر خرچ کیا گیا روپیہ قومی ترقی کے لیے بہت بڑا کردار ادا کرے گا۔ یہ احساس جاگزیں کئے بغیر اس وقت کی انجمن حمایت اسلام کے قلیل وسائل میں کالج کے حصہ میں حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ یہ کام فقط ڈاکٹر تاثیر جیسی شخصیت کے بس کا تھا۔ یہ ان کی مقناطیسی شخصیت کا اعجاز تھا کہ دو برس میں کالج کے اساتذہ کی تعداد تقریباً پچاس ہو گئی جبکہ ۱۹۴۸ء میں یہ فقط بارہ یا پندرہ تھی۔ جن حضرات نے بطور اساتذہ کے کالج میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ان

کے انتخاب کے لیے ڈاکٹر تاثیر کو داد دینی چاہیے۔ ان میں پروفیسر علاؤ الدین صدیقی،
وفیسر ایس ایم اسلم اور خواجہ غلام صادق شامل تھے جنہوں نے بطور دانشور اور ماہرِ تعلیم
ہت نام پایا۔ ڈاکٹر تاثیر کی نظر میں تعلیم میں شرف حاصل کرنے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔
تانچہ ان کی خصوصی توجہ اور قابل اور محنتی اساتذہ کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۹ء ہی میں
الج کے نتائج یونیورسٹی کے اوسطاً نتائج سے بہتر آنے لگے۔ ایف ایس سی اور بی ایس سی
کے امتحانوں میں طلباء نے اول پوزیشن حاصل کی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ آزادی کے بعد نوجوان نسل میں بوجوہ بہت سے منفی رجحانات
یدا ہو چکے تھے۔ ان کی توانائیوں کے رُخ کو منفی رجحانات سے موڑ کر علم و ادب کی طرف
انا بہت بڑا کام تھا لیکن ڈاکٹر تاثیر نے یہ کام بہت خوبی سے سرانجام دیا۔ کالج میں ایک
چھی لائبریری کی بہت ضرورت تھی۔ جس کے لیے کتابوں کا انتخاب بہت بڑا کام تھا۔
اکٹر تاثیر سے بہتر یہ کام کون کر سکتا تھا۔ انہوں نے پرنسپل کے دور میں کالج لائبریری میں
اروں کتب کا اضافہ کیا اور لائبریری میں ایسا ماحول پیدا کیا جس سے طلباء کے
وقِ مطالعہ میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر تاثیر ۱۹۳۲ء میں جب وہ بطور استاد منسلک تھے تو انہوں
نے ''بزمِ فروغ اُردو'' کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء میں
وقِ ادب پیدا کرنا تھا ''بزم فروغ اُردو'' ڈاکٹر تاثیر کے بطور پرنسپل تقرر کے کافی عرصہ
ہلے عملاً اپنا وجود کھو بیٹھی تھی۔ ایک تو عالمی جنگ کے بعد جدوجہد آزادی سے پیدا ہونے
لے حالات نے کالج میں ادبی سرگرمیوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ چراغ حسن حسرت،
ض احمد فیض، مجید ملک اور ڈاکٹر تاثیر، جنگی ضروریات کے پیشِ نظر لاہور چھوڑ چکے تھے اور
ن کی ترجیحات کا مرکز دلی تھا اس طرح سے ظاہر ہے کہ ایک ادبی خلا پیدا ہو گیا تھا جس نے
لج کی ادبی فضا کو بھی متاثر کیا۔ ڈاکٹر تاثیر کی بطور پرنسپل تقرری کے بعد حالات میں

تبدیلی آ چکی تھی اور اہلِ ادب دوبارہ لاہور کا رُخ کر رہے تھے حسن اتفاق سے انہی دنوں سیّد عابد علی عابد، دیال سنگھ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے ان کے آنے سے دیال سنگھ کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں نئی جان پڑ گئی۔ مشاعرے منعقد ہونے لگے علمی اور ادبی محفلوں کا دوبارہ اجرا ہوا اور اہل علم وادب کے لیے دیال سنگھ کالج کی صورت میں ایک فعال مرکز مہیا کیا گیا۔ یہی صورت حال ڈاکٹر تاثیر کے نزدیک اسلامیہ کالج کی تھی۔ ان کی مقناطیسی شخصیت کے سبب اہلِ علم وہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ اب لاہور میں دو نامور کالجوں میں علمی اور ادبی محفلیں جمنے لگیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ سیّد عابد علی عابد اور ڈاکٹر تاثیر دو نامور ادیب ایک ہی وقت میں لاہور کی دو بڑی درسگاہوں کے سربراہ بنے جو آپس میں گہرے دوست بھی تھے۔ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں سے پورے لاہور کی ادبی محفلوں میں جان پڑ گئی۔ مشاعرے منعقد ہوتے، مباحثوں اور مناظروں کا انتظام کیا جاتا غرضیکہ اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر کی بطور پرنسپل تقرری نے لاہور کی ادبی فضا میں زبردست مہمیز کا کام کیا۔

اسلامیہ کالج کا مجلّہ ''کریسنٹ'' ان دنوں جن ادیبوں کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا ان میں جناب عبدالمجید سالک، حمید احمد خان اور علم الدین سالک شامل تھے۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا ''کریسنٹ'' ایک بے جان مجلّہ نہ تھا جس میں کالج کے تعلیمی اور دیگر اعداد وشمار شائع ہوتے بلکہ اس کی حیثیت ایک ادبی مجلّے کی سی تھی جس میں نامور اہلِ قلم اپنی نگارشات شائع کراتے بطور طلباء کے جن اہل قلم کے مضامین ''کریسنٹ'' میں شائع ہوئے وہ بعد میں بڑے نامور ادیب بنے اس طرح سے اسلامیہ کالج نے ان دنوں نہ صرف ادبی سرگرمیوں کو مہمیز کیا بلکہ مستقبل کے اہلِ قلم کی تربیت بھی کی۔

''کریسنٹ'' میں چھپنے والے مضامین اور اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں

اسلامیہ کالج کھیل کے میدان میں بھی بڑی پوزیشن حاصل کر چکا تھا۔ کھیل کے میدان میں اس کالج کا مقابلہ اگر کسی سے تھا تو فقط گورنمنٹ کالج لاہور سے۔ ڈاکٹر تاثیر کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ان دونوں کالجوں کی کھیل کے میدان میں وہی پوزیشن تھی جو انگلستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ کی کھیل میں تھی۔ دونوں کالجوں کے کھیل کے مقابلے اس ذوق وشوق سے دیکھے جاتے تھے جوان کی دو عظیم ملکوں کے درمیان ہے۔ وہی جوش وخروش وہی حریفانہ چپقلش اور وہی میچ کے بعد آپس میں دوستی۔ وطن ہائی سکول اور اسلامیہ کالج ہوسٹل کے درمیان ایک وسیع کھیل کا میدان اب بھی موجود ہے جس کو صحیح معنوں میں آباد ڈاکٹر تاثیر نے کیا۔ کرکٹ کے علاوہ فٹ بال، ہاکی، تیراکی، بیڈمنٹن کے کھیل بھی ان دنوں بہت مقبول تھے اور دوسرے کالجوں کے ساتھ مقابلوں میں حاضرین میں ویسا ہی جوش وخروش ہوتا جیسا کرکٹ کے کھیل میں۔ اپنی تعلیمی ادبی اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں کے میدان میں اسلامیہ کالج اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر تاثیر کے زمانے میں بھی ریلوے روڈ کا کیمپس ناکافی دکھائی دینے لگا تھا۔ جناب ڈاکٹر تاثیر تو ۱۹۵۰ء میں فوت ہو گئے تھے مگر اس کے چند برس بعد شاید پچاس کی دہائی کے وسط میں سول لائنز میں ایک بلڈنگ حاصل کی گئی جس میں آرٹس کے طلباء کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کی گئیں اس طرح سے سائنس اور آرٹس کے کیمپس الگ الگ ہو گئے چنانچہ اب اسلامیہ کالج کے دو حصے ہوئے ایک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور دوسرا اسلامیہ کالج سول لائنز۔ یہ ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ ان کی وفات کے بعد بھی کالج ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور اسے بعد میں حمید احمد خان، کرنل اسلم اور اختر الدین جیسے قابل اور محنتی پرنسپل ملے۔ ڈاکٹر تاثیر کو خراج تحسین کے طور پر اسلامیہ کالج میں روایت کے طور پر ''شمعِ تاثیر'' کے نام سے ہر سال ایک مشاعرہ منعقد ہوتا تھا جس میں ملک بھر کے نامور شعرا شرکت کرتے۔ حفیظ جالندھری،

عبدالمجید سالک، عبدالحمید عدم، صوفی تبسم، سیّد عابد علی عابد کے نام قابل ذکر ہیں ۔
ڈاکٹر تاثیر اور عابد علی عابد کے لاہور کی دو نامور درسگاہوں میں اجتماع کو بھی قران السعد ین
ہی کہتے مگر عجیب اتفاق ہے کہ ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بھی اے ایس بخاری
یعنی پطرس بخاری تھے جو علم و ادب کے میدان میں اپنی ذات میں انجمن تھے سو ایسے
اہلِ علم وادب کی لاہور میں موجودگی سے لاہور کی ادبی فضا میں ایک عجیب قسم کی تابانی پید
ہوگئی تھی جس سے غیر تدریسی ادارے بھی منور رہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جن حالات میں ڈاکٹر تاثیر نے بطور پرنسپل اپنے دور کا
آغاز کیا وہ بڑا بحرانی دور تھا۔ ان حالات میں ان طالب علموں کو سنبھالنا جن کے کنبے لٹ لٹ
کر آئے تھے جان جوکھوں کا کام تھا۔ طلباء کا طبقہ معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہوتا
ہے۔ نوجوانی، تعلیم اور آگہی یہ سب مل کر ۱۹۴۷ء جیسے حالات میں طلباء میں بڑے منفی
جذبات پیدا کر سکتے تھے مگر ڈاکٹر تاثیر کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس وقت
طلباء کی توانائیوں کو مثبت موڑ دینا ضروری ہے۔ انجمن بھی مالی بحران کا شکار تھی۔ اس وقت
طلباء کو تعلیم کی طرف مائل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ کیونکہ پچھلی دو ریاستوں سے طلباء کسی
نہ کسی شکل میں سیاست میں ملوث تھے۔ سیاست کے شوروغل کے مقابلے میں حصولِ تعلیم کا
ذوق اور سنجیدہ کام کس کو بھاتا تھا، اس کے لیے حکمت عملی کی ضرورت تھی۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنے ذاتی اثر سے اس وقت کے مشہور دانشور اور ماہرین تعلیم کو کالج کے
تدریسی عملے میں شامل کیا۔ ان میں خواجہ اسلم، پروفیسر غلام صادق، علاؤالدین صدیقی اور
پروفیسر اختر شامل تھے۔ ان سب نے آنے والے وقت میں بہت نام پیدا کیا اور اپنے وقت
کے مشاہیر میں شامل ہوئے۔ کالج کی غیر تدریسی سرگرمیاں بھی طلباء کے لیے بہت کشش کا
باعث ہوتی ہیں چنانچہ اسلامیہ کالج ان دنوں مشاعروں اور ادبی محفلوں کا مرکز بن گیا۔

ڈاکٹر تاثیر کی پرنسپلی کا دور تقریباً دو برس پر محیط تھا۔ اس عرصہ میں کالج کے اختلافی مسائل کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر ڈاکٹر تاثیر کوئی عام قابلیت کے آدمی ہوتے تو ان کے لیے بیک وقت مختلف النوع امور کی طرف توجہ دینا ممکن نہ ہوتا مگر وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ یونیورسٹی کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تدریسی امور میں ذاتی دلچسپی لیتے رہے وہ انگریزی اور اردو، دونوں شعبوں کے نگران تھے۔ انگریزی ان کا خاص مضمون تھا اور انہیں یہ اچھی طرح احساس تھا کہ اگر انہوں نے کیمبرج میں سیکھا ہوا علم طلباء تک نہ پہنچایا تو بطور استاد کے یہ ان کی ایک طرح سے ناکامی ہوگی

ان کے دور میں لائبریری میں کتب کا سینکڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ایسے دور میں جب ہر قسم کا کاروبار ٹھپ تھا پرنٹنگ کی صنعت بھی اس بحران کی زد میں تھی بہت سے پریس بند ہو چکے تھے اور ان کے مالکان ترک سکونت کر کے جا چکے تھے۔ ایسے میں معیاری کتب کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر ڈاکٹر تاثیر نے اپنی ذاتی کوششوں سے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ فقط کتابوں کی تعداد میں اضافہ کافی نہ تھا طلباء میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنا بے حد ضروری تھا۔ ڈاکٹر تاثیر خود پڑھنے پڑھانے کے بے حد شوقین تھے۔ انہوں نے لائبریری کو اس انداز سے منظم کیا اور اس طرح کی سہولیات فراہم کیں کہ طلباء اکثر اپنا فارغ وقت لائبریری میں گزارتے۔ ایک برس میں طلباء کو جاری ہونے والی کتب کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ لائبریری سائنس کتب جدید خطوط پر استوار ہو چکی تھی مگر ان دنوں میں ابھی کسی کالج میں طریقہ کار بہت منظم نہ تھا۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنے دور میں سارے لائبریری نظام کو جدید ترین خطوط پر منظم کیا، کارڈ سسٹم اور کیٹالاگ وغیرہ کی سہولیات فراہم کیں جس سے کتاب کے حصول میں بہت آسانی ہوگئی۔ ڈاکٹر تاثیر کیمبرج یونیورسٹی میں لائبریری کے جدید نظام کا مطالعہ کر کے آئے تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ نظام یہاں بہت کامیابی کے

ساتھ چل سکتا ہے۔ لائبریری کے نظام کی تنظیمِ نو اور اسے جدید خطوط پر استوار کرنا ڈاکٹر تاثیر کے دور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

۱۹۳۲ء میں جب ڈاکٹر تاثیر کالج کی جے اے وی کلاسز سے منسلک تھے اس دور میں "بزمِ فروغِ اردو" کی بنیاد رکھی گئی تھی جو تقریباً دس برس تک کافی فعال رہی مگر ۱۹۴۰ء کی دہائی کے پُرآشوب دور میں یہ عملی طور پر غیر متحرک ہوگئی اس کی وجہ سمجھنی نہایت آسان ہے کہ تقریباً دس برس تک پوری قوم جدوجہد آزادی میں مصروف رہی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کے آنے کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جس نے تدریسی اور غیر تدریسی دونوں قسم کی سرگرمیوں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر تاثیر نے جب بطور پرنسپل، اپنے دور کا آغاز کیا تو حالات ابھی بہت پرسکون نہ تھے لیکن طوفان کچھ تھم گیا تھا۔ چنانچہ زندہ قوموں کی روایات کے مطابق پرآشوب حالات کے باوصف کالج میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا۔ اس دور میں پطرس بخاری، حفیظ جالندھری، سیّد عابد علی عابد، فیض احمد فیض، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم اور امتیاز علی تاج جیسی شہرہ آفاق شخصیات لاہور میں موجود تھیں۔ ان سب کا رابطہ ان مرکزوں سے، جو تقسیمِ ہند سے قبل ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھے، اب مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ لاہور ان دنوں واحد ثقافتی مرکز تھا جہاں اہلِ قلم و ادب اور شعراء کی سرپرستی ممکن تھی۔ ایک تو ڈاکٹر تاثیر کی ذاتی دلچسپی دوسرے اس وقت کے مخصوص حالات ادبی محفلیں اور مشاعرے روز کا معمول ہو گئے۔ اس دور میں لاہور کی تین بڑی درسگاہوں میں یعنی دیال سنگھ کالج، گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج تینوں میں ایسی شخصیات بطور پرنسپل تعینات تھیں جن کی ذاتی کوشش ہی ادیبوں اور شاعروں کو کھینچ لانے کے لیے کافی تھی۔ دیال سنگھ کالج میں سیّد عابد علی عابد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پطرس بخاری تھے۔ ڈاکٹر تاثیر،

پطرس بخاری اور عابد ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست بھی تھے۔ ان تینوں حضرات کی ایک وقت میں لاہور موجودگی نے، وہ بھی تین بڑی درسگاہوں کے سربراہوں کی حیثیت سے وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو بہت مہمیز کیا۔ یہ تینوں کالج ایسے ادبی مراکز میں تبدیل ہو گئے جن کی کشش بڑی بڑی شخصیات کے کھنچے چلے آنے کا باعث بنی۔

کھیل کے میدان میں بھی اسلامیہ کالج نے بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، باکسنگ، کبڈی، پہلوانی غرضیکہ آپ نام لیجئے اور آپ کو اسلامیہ کالج کی نمایاں کارکردگی دکھائی دے گی۔ اگرچہ اسلامیہ کالج کے طلباء نے تعلیم کے میدان میں بھی بڑے جوہر دکھائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مقابلے میں اسلامیہ کالج میں داخل ہونے والے طلباء کا تعلیمی پس منظر نسبتاً کمزور ہوتا تھا۔ اسلامیہ کالج غریب اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کی درسگاہ تھی اس لیے تعلیمی میدان میں گورنمنٹ کالج کی سبقت آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ کھیل کے میدان میں البتہ اسلامیہ کالج، گورنمنٹ کالج کا صحیح حریف ثابت ہوا۔ اسی طرح کبڈی، باکسنگ اور پہلوانی کے مقابلوں میں اسلامیہ کالج نے اپنی برتری برقرار رکھی۔

کالج میں مختلف علمی تنظیمیں بھی قائم رہیں۔ سائنس ایسوسی ایشن، ایسوسی ایشن آف سوشل سائنسز، فلم سوسائٹی اور فوٹو آرٹ کلب بہت فعال تنظیمیں تھیں۔ یہ بات شاید اسلامیہ کالج کی ثقافتی روایات کے منافی تھی اس لیے کالج میں ڈرامیٹک سوسائٹی کا ذکر نہیں ملتا۔ اسلامیہ کالج کے مقابلے میں دیال سنگھ کالج اور گورنمنٹ کالج کے ڈرامہ کلب بہت فعال تھے۔ ثقافتی روایات کے علاوہ کالج، انجمن حمایت اسلام کی براہ راست نگرانی میں تھا اس انجمن کے سرکردہ رکن کی اپنی تربیت ایسی تھی کہ وہ ڈرامیٹک سرگرمیوں کو بہت پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ جہاں ان دنوں گورنمنٹ کالج اور دیال سنگھ کالج میں

بہت بڑے بڑے ڈرامے سٹیج کیے گئے وہاں اسلامیہ کالج میں اس نوعیت کی سرگرمیوں کا سراغ نہیں ملتا۔ جہاں تک طبیعت اور مزاج کے میل کا تعلق ہے ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری اور عابد علی عابد کے بہت قریب تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مجبوریوں کے تحت انہوں نے ڈرامیٹک سوسائٹی کی بہت حوصلہ افزائی نہ کی۔

تصانیف

آتش کدہ (شعری مجموعہ)

(ان کے انتقال کے بعد تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں) پہلا ایڈیشن بیگم تاثیر نے ان کے انتقال کے اڑہائی سال کے بعد انشاء پریس سے شائع کرایا۔

کنول (ناول)

(قیام پاکستان کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے تحریر کیا۔ وہ اس کو ۱۹۵۱ء میں شائع کروانا چاہتے تھے لیکن یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

"عزیزم کے نام" (مکاتیب)

یہ خطوط انہوں نے اپنے چہیتے شاگرد محمود نظامی کے نام تحریر کیے تھے اور یہ خطوط ۱۹۵۴ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔

اقبال کا فکر و فن

(اقبال کے حوالے سے لکھے ہوئے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے یہ مضامین افضل حق نے مرتب کیے اور ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ اس کے دو تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مقالات تاثیر

(ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے یہ مقالے ۱۹۷۸ء میں "مجلس ترقی ادب" نے شائع کیے۔ اور ممتاز اختر مرزا صاحبہ نے انہیں مرتب کیا۔

انگریزی مقالہ برائے پی ۔ ایچ ۔ ڈی

India and the near East in English Literature from the Earliest Times to

Iqbal the universal Poet .

(Edition Afzal Haq)

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے اسے کیمرج یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے جمع کروایا تھا اور یہ ۱۹۳۶ء میں مکمل ہوا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے افسانے، ڈرامے، تراجم، بہت سی نظمیں اور مضامین مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہے لیکن ان کو کتابی کی صورت میں ابھی تک نہیں لایا جاسکا۔

ڈاکٹر تاثیر بطور شاعر

ڈاکٹر تاثیر کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ان کے مجموعۂ کلام ''آتشکدہ'' میں شامل ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام ۱۹۳۲ء میں شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی اپنے کسی دوست کے سپرد کردی تھی مجموعۂ کلام کا نام ''آتشکدہ'' بھی انہوں نے خود رکھا تھا مگر اس کی اشاعت کا اہتمام ان کی وفات کے کوئی ڈھائی برس بعد ہوا۔ اگرچہ ''آتشکدہ'' طبع اول سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تاریخ اشاعت کیا ہے مگر بلقیس تاثیر کا دیباچے میں یہ لکھنا، جو انہوں نے طبع اول کے آغاز میں تحریر کیا ہے کہ یہ مجموعہ ڈاکٹر تاثیر کی وفات کے ڈھائی برس بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ کی تاریخ اشاعت کو ۱۹۵۳ء کے آخر میں متعین کرتا ہے۔ اس بالواسطہ شہادت سے قطع نظر ''آتشکدہ'' کی اشاعت کے وقت مسز بلقیس تاثیر، عابد صاحب سے اکثر مشاورت کرتی رہتی تھیں۔ اس کے لیے پیش لفظ، عابد صاحب نے تحریر کیا تھا۔ ابتدایہ ایس ایم شریف نے تحریر کیا تھا جو اس وقت ناظم تعلیم محکمہ پنجاب تھے۔ ایس ایم شریف بعد میں مرکزی حکومت کے سیکرٹری ایجوکیشن بھی رہے اور ڈاکٹر تاثیر کے بہت گہرے دوستوں میں تھے۔ ''ڈاکٹر تاثیر میری نظر میں'' کے عنوان سے لکھا ہوا یہ ابتدایہ ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت کے بارے میں ہے جبکہ پیش لفظ میں عابد صاحب نے ڈاکٹر تاثیر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ بقول مسز تاثیر:

> ''اس مجموعہ میں ڈاکٹر تاثیر کے کلام کا انتخاب شائع ہوا کیونکہ اکثر دوستوں کی رائے تھی کہ انتخاب بھی شائع ہونا چاہیے۔''

یہ رائے تسلیم کر لی گئی اور کانٹ چھانٹ کے بعد ''آتشکدہ'' منظر عام پر آیا۔ ''آتشکدہ'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع کیا گیا۔ اس ایڈیشن میں ڈاکٹر تاثیر کی چھ نظموں اور چند قطعات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ایڈیشن انہی شعری تخلیقات پر مشتمل ہے جو پہلے ایڈیشن میں شامل تھیں۔ ایک ذرا سا فرق یہ ہے کہ پہلا ایڈیشن اپنی ترتیب کے لحاظ سے بہتر تھا۔ ''آتشکدہ'' کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جس میں عابد علی عابد مرحوم اور ایس ایم شریف مرحوم کی تحریریں شامل ہیں جبکہ فیض احمد فیض کی لکھی ہوئی ڈاکٹر تاثیر کی شاعری کے بارے میں رائے اور آفتاب احمد خان کا پیش لفظ شامل ہے۔ اس ایڈیشن میں چند قطعات کا اضافہ کیا گیا ہے جو پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں ہیں۔

تیسرے ایڈیشن کو مرتب کرتے وقت ایک بے احتیاطی جو کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کی مختلف نظمیں جو قلمی ناموں سے چھپی تھیں اس میں شامل ہیں مگر اس میں ایسی نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو ڈاکٹر تاثیر نے تحریر ہی نہیں کی تھیں اور کچھ ان کے خلاف بھی تھیں۔ ان نظموں میں کچھ چراغ حسن حسرت کی لکھی ہوئی تھیں اور ''روزنامہ امروز'' میں چھپی تھیں۔ ان نظموں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو ڈاکٹر تاثیر کا ایسا کلام موجود ہے جو ان تینوں ایڈیشنوں میں بھی شائع نہیں ہوا۔ کلام غالب کے انداز میں ''آتشکدہ'' کو بطور انتخاب کے لیے رہنے دیا جائے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کا بقیہ کلام یکجا کر کے ''کلیاتِ تاثیر'' شائع کی جائے کہ وقت کے ساتھ انتخاب کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے اور قارئین تمام کلام کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کی شاعری پر کوئی بہت تنقیدی کام نہیں ہوا اور جس پائے کے وہ شاعر تھے اس کے مطابق ان کا مرتبہ متعین نہیں ہوا۔ زیرِ نظر کتاب میں سید عابد علی عابد کا مضمون جو ''آتشکدہ'' طبع اول و دوم میں بطور پیش لفظ شائع ہوا تھا شامل کیا جا رہا ہے کہ اس سے زیادہ تفصیلی تنقید ڈاکٹر تاثیر کی شاعری پر اب تک نہیں ہوئی۔

”آتشکدہ“ پر سیّد عابد علی عابد کا دیباچہ

ڈاکٹر تاثیر کی شاعری پر ہمیں تنقیدی کام بہت کم نظر آتا ہے اس حوالے سے سید عابد علی عابد کا ڈاکٹر تاثیر کے شعری مجموعے ”آتشکدہ“ پر لکھا ہوا دیباچہ ان کی شاعری کا ایک مکمل تنقیدی جائزہ ہے اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا بیشتر حصہ شامل کیا جا رہا ہے۔

”آتشکدہ“ کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر تاثیر کے کلام کا جو منتخب مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔اس میں کم وبیش سبھی کچھ ہے۔ غزلیں بھی ہیں، قطعات بھی ہیں، نظمیں بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صنفِ شعر کے بدل جانے سے شاعر کی ذہنی ساخت اور فکری پیمانے نہیں بدل جاتے۔ ہر صنف میں شاعر کے سوچنے کا اسلوب اور ذہنی واردات کو بیان کرنے کا ڈھنگ ایک سا ہوتا ہے۔فرق صرف صنف کی ہیئت کا ہوتا ہے۔اس اعتبار سے غزل اور نظم سے علیحدہ علیحدہ بحث کرنا بنیادی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو کی کلاسیکی غزل مخصوص روایات کی حامل اور کچھ سمجھوتوں کی پابند ہے۔ لیکن غزل کا معیار ایسا لچکدار ہے کہ وہ ردیف اور قافیے کی پابندی کے باوجود ان مطالب اور معانی کو بھی بیان کرسکتی ہے جنہیں کلاسیکی روایت تغزل کے دائرے سے خارج سمجھتی ہے۔ حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی غزلیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔ یہی حالت بیسویں صدی میں نظم کی ہے۔ جہاں

غزل خالص تغزل کے سوا دوسرے مطالب کے بیان پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ وہاں نظم بھی بدرجہ احسن ہر قسم کی واردات کو بیان کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہو سکتا ہے کہ غزل میں کوئی شعر واردات عاشقی سے متعلق نہ ہو اور وہ اچھی غزل ہو اور نظم خالص تغزل کے اسلوب میں واردات عاشقی کو بیان کرے اور غزل میں اور اس میں صرف ہیئت کا فرق ہو۔ یہ اور بات ہے کہ شاعر قصداً مخصوص مطالب اور معانی بیان کرنے کے لیے نظم کو ذریعہ اظہار بنائے۔ درآں حال وہی مطالب و معانی غزل میں بھی بیان ہو سکتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غزل کو مخصوص ذہنی تجربات کے اظہار کے لیے استعمال کریں۔ حالانکہ وہی بات نظم میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تاثیر کا طبعی میلان نظم کی طرف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ غزل کی ہیئت کی پابندیوں کی وجہ سے کچھ معنی نازک گفتنی ہوتے ہیں، بیان ہونے سے رہ جاتے ہیں کہ ایسا تو نظم میں بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ غزل کی ہیئت میں تصرف کرنا ناممکن ہے کسی خاص غزل میں ایک آدھ رکن کے اضافے سے ایک آدھ رکن کے حذف کرنے سے غزل کی بنیادی ہیئت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف نظم کی ہیئت میں تصرف کیا جا سکتا ہے۔ خیال کے طویل سلسلے کو ہیئتی تصرف کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے۔ نظم کے ٹکڑوں کے گھٹانے بڑھانے سے خیال کے دوائر کا گھٹنا بڑھنا دکھایا جا سکتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہہ لیجیے کہ نظم میں Punctuation یا علامتِ اوقات کو صحیح طور پر برتا جا سکتا ہے۔ بندوں کو علیحدہ کر کے ایک سلسلۂ خیال کا ختم ہونا اور دوسرے سلسلۂ خیال کا شروع ہونا دکھایا جا سکتا ہے۔ قوافی کے سلسلوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ ایک مصرعے یا ایک لفظ یا ایک جملے کی تکرار سے منشائے ذہنی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل میں یہ صورت نہیں ہے۔ وہاں ہر شعر اکائی ہے اور مان بھی لیجیے کہ غزل

مسلسل ہے یا ایک ہی موڈ (تاثر) کا اظہار کرتی ہے تو بھی ہر مصرعے کے وزن کا یکساں
ہونا اور قافیے کا آخر میں آنا سلسلۂ خیال کی توقیف میں ضرور خلل انداز ہوگا۔ یہی وجہ ہے
کہ ڈاکٹر تاثیر کے ہاں جو باتیں گفتنی ہیں۔ بیشتر نظم میں کہی گئی ہیں اور غزل کو اس نے بیشتر
کلاسیکی روایت کے دائرے ہی میں رکھا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تاثیر کی غزل گوئی حقیقت میں مشقِ سخن ہے۔ غزل کہہ
کے وہ اپنے زور بازو کو آزمانا چاہتا ہے کہ اصل میں اس زور کو نظم میں صرف ہونا تھا۔
س کا مطلب یہ نہیں کہ تاثیر کی غزل یکسر روایتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غزل میں بھی اس
نے بتدریج ان سمجھوتوں کو ترک کر دیا ہے جو بدلتے ہوئے معاشری اور تمدنی حالات
کے پیش نظر بالکل غیر فطری اور مصنوعی ہو گئے تھے۔ بیس سے تیس سال تک کی عمر
یں تاثیر نے جو غزلیں کہی ہیں ان کا انداز یہ ہے:

یہ بھی رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ

رُک رُک کے ہو رہے ہیں ادا حرفِ معذرت
کچھ کچھ غرور بھی ہے بہانے کے ساتھ ساتھ

کس نے کب کس پہ کیا ظلم یہ قصہ کیا ہے؟
تم اگر بھول گئے ہو تو مجھے یاد نہیں

یہ گلستاں ہے کہ زنداں ہے کہ صحرا کیا ہے
کوئی بجلی نہیں، گل چیں نہیں صیاد نہیں

اِک نظر ایک چمکتا ہوا آنسو سرِ بزم
اور رودادِ محبت مجھے کچھ یاد نہیں

آخری تین اشعار کی فکری نیرنگی اور گونا گونی پر غور کیجئے گا۔ پہلا شعر داغ کی معاملہ بندی اور وقوع گوئی کی یاد دلاتا ہے۔ دوسرے کا مقام نسبتاً بلند ہے۔ تیسرے شعر پر اقبال کے اس شعر کا نمایاں اثر معلوم ہوتا ہے۔

یک نگاہ یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیز سوگندے دگر

اسی زمانے کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

اس میں دو تین شعر وہی داغ کی معاملہ بندی کے سے ہیں۔ جس کا تاثیر پر بڑا گہرا اثر تھا۔ مثلاً

آ کر بھی ناشاد کیا تھا
جا کر بھی ناشاد کرو گے

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے:

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

میں نے ابھی کہا ہے کہ تاثیر پر داغ کی وقوع گوئی اور معاملہ بندی کا بہت اثر تھا۔ آخری
وں میں جو اس نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی یہ رنگ برابر جھلکتا ہے۔ داغ کی غزل
متعلق ان کا خیال تھا کہ ان میں ڈرامائی عنصر بہت ہے اور کبھی ایسا مزہ دے جاتا ہے کہ
وشاید۔ اور وہ داغ کا یہ شعر بہت مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔

اپنی تصویر پہ نازاں ہو، تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا، حیرت میری

انہوں نے بڑی عقیدت سے داغ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور بعض غزلوں میں کچھ
عار ایسے ہیں کہ داغ کے اشعار سے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً عمر کے آخری چند
وں کی غزل ہے:

غیر کے خط میں مجھے ان کے پیام آتے ہیں
کوئی مانے کہ نہ مانے میرے نام آتے ہیں

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

واعظِ شہر کی محفل ہے کہ ہے بزمِ نشاط
حوضِ کوثر سے چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں

اس غزل میں داغ نے ایک نہایت اچھا شعر کہا تھا۔

راہرو راہِ محبت کا خُدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تاثیر نے اس سے ہٹ کر نہایت تیکھا شعر کہا ہے:

یہ رہِ شوق رہِ عشق ہے اے اہلِ ہوس
منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں

وقوع گوئی یا معاملہ بندی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ان واردات عاشقی کا بیان ہے جو عام طور پر پیش آتی رہتی ہیں۔ جو واقع ہوتی ہیں۔اب داغ کی وقوع گوئی ایک خاص تمدنی مزاج اور معاشرت کی ترجمان ہے۔داغ کی محبوبہ مسلم ہے کہ ایک طوائف ہے۔یہ تو سب جانتے ہیں کہ داؔغ اور حجابؔ کے مراسم کیا تھے۔ جب داغ، حیدرآباد میں تھے تو انہوں نے وہاں بھی ایک طوائف ملازم رکھی تھی۔حجاب بھی آخر داغ کے پاس رہنے لگی تھیں۔ دہلی اور رام پور میں بھی اوائل عمر ہی میں داغ کو ایسے مواقع اکثر ملے تھے کہ وہ طوائفوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ سکے۔داغ کے کسی سوانح نگار نے حجاب کے قصّے کے سوا داغ کے کسی اور معاشقے کا ذکر نہیں کیا۔اس تمہید کا مقصود یہ ہے کہ داؔغ کے ہاں معاملہ بندی اور وقوع گوئی کا جو اسلوب ہے اس کا تعلق طوائف ہی سے ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے کی طوائف اکثر شائستہ، نستعلیق اور مزاج دان ہوتی تھی لیکن ہوتی تو آخر طوائف ہی تھی۔یہی وجہ ہے کہ داغ کی معاملہ بندی میں چھیڑ چھاڑ، طعن و تشنیع اور محبوبہ کو جلی کٹی سنانے کے مضامین عام ہیں۔تاثیر نے داغ کی معاملہ بندی پر نظر ڈالی تو اسے حقیقت کے بہت قریب پایا۔اس لیے انہیں داغ کا یہ اسلوب بہت پسند آیا کہ داغ کی بات بلند مقام سے ہو یا نہ ہو لیکن دل پذیر، شوخ اور کھری ضرور ہے۔ظاہر ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے وہ تمدنی ماحول نہیں پایا جو داغ نے پایا تھا۔بیسویں صدی کے آغاز ہی میں طوائفوں کے ہاں آنا جانا معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔علاوہ ازیں اب وہ شائستہ اور نستعلیق طوائف بھی نہیں رہی تھی۔

.وقوع گوئی کا موضوع بن سکتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نظر بازی کے راستے مسدود ہو
ئے تھے اور وقوع گوئی کے موضوع ناپید ہو گئے تھے۔ معاشرت بدل گئی تھی، تمدنی مزاج
ل گیا تھا۔ اخلاقی اقدار بدل گئی تھیں لیکن نظریں نظروں سے پھر بھی ملتی تھیں۔ وقوع گوئی
کے موقعے پھر بھی پیدا ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعے داغ کے موقعوں سے بالکل مختلف
تھے۔ تاثیر نے ان تمام موقعوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کو گہری نظر
سے دیکھا ہے۔ داغ کے رنگ میں وقوع گوئی کی ہے۔ لیکن ترجمان وہ اپنے ماحول اور
نی معاشرت ہی کا ہے۔ داغ کے شاگردوں میں اور ڈاکٹر تاثیر میں یہی نمایاں فرق ہے۔
غ کے بیشتر شاگرد داغ ہی کے مضامین میں تصرف کر کے کچھ شعر کا تیور بدل کر سمجھتے تھے
لہ یہی وقوع گوئی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بساط طے ہو چکی ہے۔
س قسم کی معاملہ بندی وہ لکھتے ہیں وہ مشاہدے میں نہیں آتی۔ اس کے برخلاف تاثیر کی
وع گوئی عین اس کی زندگی کی اقدار اور اس کے ماحول کی ترجمان ہے۔ میری نظر میں یہ
.دو شعر گوئی میں بہت بڑا اضافہ ہے کہ معاملہ بندی جو عملاً مٹتی چلی جا رہی تھی،
اکٹر تاثیر نے اس کا احیاء کیا۔ تاثیر کی یہ غزل دیکھئے جس میں معاملہ بندی کا موضوع
ائف نہیں بلکہ بیسویں صدی کی شائستہ اور نستعلیق عورت ہے۔ اس کے ساتھ بات
نبھال کر کرنا پڑتی ہے کہ سمجھ دار بھی ہے اور طرح دار بھی۔ یہاں نظر بازی کا اسلوب بالکل
ختلف ہے۔ بات کرنے کا ڈھب بالکل جدا ہے۔ ہر چند دائرہ وہی معاملہ بندی اور
.وع گوئی کا ہے۔

طے ہو گیا ہم ترکِ ملاقات کریں گے
اب تک جو نہ ہو سکتی تھی وہ بات کریں گے

غم کھا کے لہو پی کے باندازِ تغزل
جس طرح بھی ہو گی گزرِ اوقات کریں گے

یوں وہ سرِ محفل، سرِ راہے جو ملے بھی
منہ پھیر کے اوروں سے اشارات کریں گے

آداب سے مجبور اگر ہو بھی گئے ہم
ہنستے ہوئے موسم کی کوئی بات کریں گے

طے ہو گیا ہم ترکِ ملاقات کریں گے
جس طرح بھی ہو گی گزرِ اوقات کریں گے

میں نے کہا تھا کہ اگرچہ تاثیر کی غزل سرائی اصلاً مشقِ سخن ہے کہ نظم نگاری میں کام آئے لیکن یکسر روایتی نہیں ہے۔ اُردو شاعری کی ایک مسلم روایت ہے کہ چاہنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ اسے ضرور چاہے۔ اُردو کلاسیکی شاعری کے بہت سے شکوے اور گلے، ہجر کی بہت سی طویل لیکن بے مصرف راتیں، فریاد و فغاں اور آہ و زاری کے بہت سے مرحلے اسی غیر مہذب دھاندلی سے پیدا ہوئے ہیں۔ غالبًا کلاسیکی شعرا میں غالب پہلا شاعر ہے جس نے اس روایت کے خلاف احتجاج کیا اور جو بہت سی روح فرسا منزلوں سے گزر کر تہذیبِ ذہنی کے اس مقام تک پہنچا کہ:

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
لطافتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے!

نہ ہو نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانی و روش و مستی ادا کہیے!

حفیظ نے بھی اس مقام کو چھولیا تھا اگرچہ اس کے ہاں وہ توازن ذہنی نہیں جو غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے اشعار میں کچھ زہرخند کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

حسن پابند رضا ہو مجھے منظور نہیں
میں کہوں تم مجھے چاہو مجھے منظور نہیں

بیسویں صدی میں ظاہر ہے یہ دھاندلی دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔ آپ کو کسی سے محبت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اسے بھی آپ کو یا کسی اور کو چاہنے کا ویسا ہی حق حاصل ہے اس حق کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا اور بات ہے اور مجبور ہو کر رہ جانا اور بات ہے۔ رقابت کے تمام مضمون مجبوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر تاثیر کی تمام غزلوں میں رقابت کا مضمون نظر نہیں پڑا یا اگر ہوگا تو ابتدائی غزلوں میں بطریق روایت بندھ گیا ہوگا۔ جوں جوں ڈاکٹر تاثیر کا ذہنی نشوونما تہذیب کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ اسی اعتبار سے وہ محبوبہ کے اس حق کو بہ خندہ پیشانی قبول کرتے چلے گئے کہ وہ چاہے تو کسی اور سے محبت کر سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر تاثیر اس منزل سے اور آگے بڑھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس معاشرت کی وہ ترجمانی کرتے تھے اس دائرے میں ایسی عورتیں بھی پائی جاتی تھیں جو یہ تو چاہتی تھیں کہ لوگ انہیں چاہیں اور ان کی روش دلبری کی داد دیں۔ لیکن اس سے شگفتہ کلامی اور شگفتہ جبینی کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھیں۔ یہ تو شاید نسوانی فطرت ہے کہ ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ چاہی جائے۔ لیکن جدید معاشرہ ایسی عورت کا سراغ بھی دیتا ہے جو پڑھی لکھی ہے۔ شائستہ ہے، خوش

کلام ہے، شگفتہ رو ہے اور چاہتی ہے کہ بہت سے لوگ اس کے حسن یا جنس کے دائرہ طلسمی میں دائماً اسیر رہیں۔ ایسی عورت صرف مرد کو مسخر کرنا چاہتی ہے۔ مسخر ہونا نہیں چاہتی۔ اس کی بے تکلفی تغافل سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس کی خوش کلامی دشنام طرازی سے زیادہ آشوب افگن۔ تاثیر ایسی عورت سے ملے ہیں۔ اسے اچھی طرح پرکھا ہے۔ اسے چاہا ہے۔ یہ بھی خوب دیکھ لیا ہے کہ یہ صرف انہیں اپنے دام محبت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے باوجود تاثیر نے نہ صرف ایسی عورت کا حق دلبری تسلیم کیا ہے بلکہ اسے معاف بھی کیا ہے۔ یہ تہذیب ذہنی کی آخری منزل ہے۔ معاف کرنے کی جو صورت تاثیر نے اختیار کی ہے وہ بے نظیر ہے۔ انہوں نے اپنے آپ سے یہ کہا ہے کہ دلبری کی یہ تمام ادائیں، عشوہ گری کے یہ تمام اسلوب یہ خوش کلامی، یہ شگفتہ جبینی اس عورت کے فطری اوصاف ہیں۔ اس کی نیت فریب دینے کی نہیں ہے۔ وہ اس لیے ہنستی ہے کہ زندگی اسکے وجود معنوی میں فوارے کی مانند اُبلی پڑتی ہے۔ اس کی شگفتہ کلامی فریب کاری پر مبنی نہیں بلکہ لازمۂ تہذیب ہے۔ معلوم نہیں تاثیر کا ذہن کیسے کیسے دوزخوں میں سے گزرا ہوگا۔ تب اسے یہ مقام حاصل ہوا۔ یہ غزل دیکھئے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن کو بھٹی میں ڈالا گیا ہے۔ لیکن وہ تپ کر کندن ہوگیا ہے۔

وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریق آشنائی نہ رسومِ جام و بادہ

تیری نیم کش نگاہیں، تیرا زیرِ لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریب سادہ

یہ دلیلِ خوشدلی ہے میرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کمتر، مری تاب سے زیادہ

تاثیر کی ایک غزل ہے جو میرے علم کے مطابق تقسیم کے بعد کہی گئی ہے۔ یہ غزل انہیں ایک مشاعرے میں پڑھنا تھی، مجھے بھی اس مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ اتفاق کی بات ہے وہ میرے ہاں آئے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں نہ جا سکا لیکن ان سے غزل سن لی۔ ان کے بیان کے مطابق اس کی شان نزول یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے دلبری اور عشوہ گری اور فتنہ کاری کے جو معیار مختلف قوموں کے میل جول سے پیدا ہوئے تھے وہ تقسیم کے بعد یکبارگی پست ہو گئے اور پھر پست سے پست تر ہوتے چلے گئے۔ دوستوں کی بہت سی جگمگاتی ہوئی محفلیں سونی ہو گئیں۔ بہت سے اشغال و افکار کی بساط بالکل الٹ دی گئی۔ بہت سے معاشقوں کے رشتے بہ جبر و قہر توڑ دیئے گئے۔ ''نہ وہ آستاں رہے نہ وہ سنگِ در'' البتہ کچھ آشفتہ حال سر پھوڑنے کو رہ گئے۔ یہ بات مزید تشریح سے گریز کرتی ہے۔ غزل پڑھ لیجئے:

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیداد گر نہیں
خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں

ان کے بغیر تلخی کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں

تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں

بے باک چال چال سے بے باک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلوؤں سے ناامید
وہ راہ گزر کہ اب جو تری رہ گزر نہیں

یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے شعر میں پہلا مصرع ڈاکٹر تاثیر نے پہلے یوں لکھا تھا:

لاہور سے وہ کیا گئے سب کچھ چلا گیا

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تاثیر کا میلان طبعی نظم کی طرف تھا۔ مختلف علوم وفنون پر جو انہیں احاطہ تھا، مختلف زبانوں پر جو انہیں عبور تھا۔ اظہار معنی بلند پر جو انہیں قدرت تھی وہ بیشتر بے شک نظم ہی میں ظاہر ہوتی تھی لیکن غزلوں میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کتنے گہرے پانی میں تھے۔

انسان (ظاہر ہے کہ شاعر بھی انسان ہے) شروع سے، بلوغت سے، بہت پہلے سے ذہن میں حسن و جمال اور دلبری و دل پذیری کی ایک مثالی تصویر قائم رکھتا ہے۔ یہ ذہنی تصویر مختلف خطوط سے مرتب ہوتی ہے لیکن جب ایک بار ذہن میں قائم ہو چکے تو جانِ تمنا بن جاتی

ہے۔اسی مثالی تصویر کی جستجو میں شاعر اور فنکار عمر بھر سرگرداں رہتا ہے۔ جہاں اس تصویر کا
کوئی نقش کوئی خط، کوئی جھلک نظر پڑتی ہے وہیں فریفتگی اور شیفتگی کا سا عالم طاری ہوتا ہے۔
غالباً یہ تصویر اپنی پوری شان جمال میں تو کبھی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اس کے جزوی مظاہر البتہ
نظر افروز ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی صورتوں میں عشق بیک نظر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن لطف
کی بات یہ ہے کہ بعض صورتوں میں یہ جذبہ ایک بار نہیں کئی بار ابھرتا اور مٹتا ہے۔ مثالی تصویر
سے مشابہ جو صورت نظر پڑی ہے اس کی طرف تو میلانِ طبع ہوتا ہی ہے اور آگ سلگتی
ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد کوئی اور صورت مثالی تصویر کے قریب تر نظر پڑے تو تمنا کا رُخ
پھر جاتا ہے۔ اگرچہ ہر چند کہ چنگاری جوں کی توں سلگتی رہتی ہے۔ یعنی اصلی تصویر سے لگاؤ
ویسے سے ویسا ہی قائم رہتا ہے۔ اس مضمون کو میرؔ نے نہایت پیارے انداز میں بیان کیا ہے:

جیتے جی کوچۂ دل دار سے جایا نہ گیا
اُس کی دیوار کا سر سے میرے سایا نہ گیا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اس مقام کو تاثیر نے بھی بیان کیا ہے اور بڑی دقتِ نظر اور اصابت رائے کے ساتھ بیان
کیا ہے:

محبت، ناصبوری، بے قراری
محبت، قہقہے، فریاد و زاری
نہ ہونا ہو تو ترکش بے جراحت
جو ہونا ہو تو پہلا وار کاری
خرد نے ہاتھ پر تلوار روکی
جنوں نے گھونپ دی دل میں کٹاری

میں نے غزل کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ تاثیر نے غزل گوئی مشق سخن کے طور پر کی تھی۔
اپنا زور بازو آزمایا تھا اور حقیقت میں یہ زور نظم میں صرف ہونا تھا۔ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے
کہ اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے۔ زندگی کے آخری سالوں میں، میں نے ڈاکٹر تاثیر
کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اس وقت اپنی نشوونمائے ذہنی کے عروج پر تھے۔ لیکن
دراصل میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر
رہے تھے۔ ان کا ذہن دراصل مجموعۂ اضداد تھا۔ ایک طرف وہ قرآن مجید اور تفسیر و فقہ کی
باریکیوں پر نظر رکھتے تھے تو دوسری طرف برصغیر ہندو پاکستان میں فنون لطیفہ کے بہت
بڑے نقاد تھے۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے وہ عربی جانتے تھے، اُردو بولتے اور لکھتے
تھے۔ فارسی سے آگاہ تھے۔ انگریزی ادبیات کے ماہر تھے اور پنجابی زبان سے عقیدت
رکھتے تھے۔ ان کے معاملے کی یہ کیفیت تھی کہ نفسیات، عمرانیات اور اقتصادیات سے لے
کر انتقاد اور خالص ادبیات تک بہت سے علوم وفنون انہیں مستحضر تھے سائنس کے جدید
ترین انکشافات سے بھی باخبر تھے۔ اور جمال کا ایسا صحیح احساس اور شعر کا ایسا اچھا ذوق
رکھتے تھے کہ باید وشاید۔ ان کی بذلہ سنجی اور شگفتہ کلامی کا یہ عالم تھا کہ بہت سی باتیں جو شعر
میں کہی جا سکتی تھیں لطیفہ ہو کر چٹکیوں میں اُڑ گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا شخص، اس طرح کا
فنکار، جب گفتنی باتوں کے اظہار پر آمادہ ہوتا ہوگا تو اس کی دسترس میں علائم و رموز،
تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کے خزانے ہوتے ہوں گے۔ جن کو وہ حسب منشا
استعمال کرتا ہوگا۔ بات دقیق اور پیچ دار ہو تو اس کے ادا کرنے کے لیے کسی اور علم یا فن
کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ استعارے اور تشبیہ کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ تاثیر کی تو
طبیعت پیچ دار تھی، بات پیچ دار تھی۔ سوچنے کا اسلوب پیچدار تھا اور مختلف علوم وفنون پر
جو اسے قدرت حاصل تھی اظہارِ مطالب میں وہ انہیں اس طرح استعمال کرتا تھا کہ اس

کی کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی ۔ واردات دل بیان ہو رہی ہیں اور وسیلہ موسیقی کی صطلاحات میں ۔تمدنی کوائف کا ذکر ہے اور علامات و رموز نفسیات کی ہیں نفسیاتی حقیقتوں کا بیان ہے اور ابلاغ مصوری کی مصطلحات کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اس طریق کار، نے اس سلوب اظہار نے ڈاکٹر تاثیر کی منظومات میں بہت پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اسلوب کی پیچیدگیاں نہیں ہیں۔ یہ مطالب و معانی کی بلندی اور پیچیدگی ہے۔ جو طبعًا پیچدار اسلوب اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔

ڈاکٹر تاثیر جیسا کہ ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کا فنکار تھا اور بیسویں صدی کے فنکار اور شاعر کو کچھ سہولتیں بھی میسر تھیں اور کچھ دشواریاں بھی درپیش تھیں۔ سہولتیں تو یہ تھیں کہ سائنسی انکشافات اور نفسیاتی تصریحات نے شاعر کے لیے یہ ممکن بنا دیا تھا کہ وہ اپنی ذات کا نسبتًا زیادہ گہرا شعور حاصل کرے۔ فرائیڈ اور ینگ کے نظریات، طبیعات کے انکشافات اور ہیئت کی حیرت انگیز دریافتوں نے سوچنے کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اپنے متعلق، اپنے اور فطرت کے تعلق کے متعلق، فطرت کے رموز کے متعلق انسان کا علم (ظاہر ہے کہ شاعر بھی انسان ہے) زیادہ گہرا اور دوررس ہو گیا تھا، دشواریاں یہ تھیں کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے گویا دنیا ایک تپتے ہوئے دوزخ میں ڈال دی گئی تھی جس میں مختلف اقتصادی، اخلاقی اور عمرانی اقدار پگھل گئی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک انسان پر ایک تذبذب کا سا عالم طاری رہا۔ پرانی اقدار ملیامیٹ ہو گئیں لیکن نئی اقدر پوری طرح سامنے نہ آسکیں۔ دوسری جنگ عظیم نے پھر انسان کے تمدنی اور اخلاقی مزاج کو ایک کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔ یہ کڑھاؤ ابھی تک کھول رہا ہے۔ پرانی اقدار کی دھات ابھی کندن ہو کر باہر نہیں نکلی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بیسویں صدی کا شاعر اور فنکار بہت سی دشواریوں سے دوچار ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی رجحانات تغیر

پذیر اخلاقی اقدار پگھلتا ہوا تمدنی مزاج جہاں سوچنے کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ وہاں تذبذب اور ذہنی انتشار بھی پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی منظومات اس بدلتے ہوئے ماحول، ان تغیر پذیر اقدار، اس پگھلتے ہوئے مزاج کی آئینہ دار ہیں۔ ان تمام انکشافات سے بہرہ یاب ہیں جو بیسویں صدی سے مخصوص ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک، اپنے دیس اور اپنے تمدن کے مخصوص حالات کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ ان منظومات میں ایک سائنسی متوازن اور غیر متضاد نظامِ فکر کی جستجو بے سود ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی نظمیں بدلتے ہوئے ماحول کی اور پگھلتے ہوئی اقدار کی تصویریں ہیں اور ان کی بنیاد اسی ذہنی نااستواری پر ہے۔ جو بیسویں صدی سے مخصوص ہے۔ میں اس سلسلے میں دو تین نظموں کا تجزیہ کروں گا۔ مقصد یہ ہوگا کہ ایک تو یہ واضح کیا جائے کہ ڈاکٹر تاثیر کس قدر مختلف النوع علائم و رموز استعمال کرتا ہے اور معنی دقیق کو کس خوبی سے ادا کر سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے وطن اپنے تمدن کے تغیرات کے ساتھ ساتھ تمام بیرونی اور خارجی حالات کا کس قدر دقتِ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ صنعت گری اور فن کاری کے جو ثبوت اس تجزیے کے سلسلے میں مہیا ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن مطالب سے ہٹ کر نہیں۔ مراد یہ ہے کہ میں صورت کو معانی سے علیحدہ کر کے نہیں پرکھوں گا کہ نفسیاتی اعتبار سے بے ہودہ بات ہے۔ اسلوب کلام اور انداز نگارش اصلاً معانی کے تابع ہوتا ہے اور معانی سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ دونوں کو جدا کرنا صرف نظریاتی طور پر ممکن ہے۔ اقبال کہتا ہے:

اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

ان میں سے ایک نظم ''دیوداسی'' ہے پہلے یہ کلیتاً نقل کی جاتی ہے۔ پھر اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔

۱۔ بال سنوارے مانگ نکالے
دوہرا تہرا آنچل ڈالے
ناک میں بندی کان میں بالے
جگ مگ جگ مگ کرنے والے

۲۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا
آنکھ میں انجن پھیکا پھیکا
مدھ ماتی متوالی آنکھیں
جوبن کی رکھوالی آنکھیں

۳۔ آنکھ جھکائے لٹ چھٹکائے
جانے کس کی لگن لگائے
جمن کنارے پریم دوارے
برہ اداسی، درشن پیاسی
دیوا داسی تن من ہارے

تنہا اپنے آپ کھڑی ہے
بت بن کر چپ چاپ کھڑی ہے

اس نظم کے دو پس منظر ہیں۔ ایک تاریخی دوسرے نفسیاتی دونوں سے ڈاکٹر تاثیر کما حقہٗ آگاہ ہے اور واضح رہے کہ یہ نظم ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی ہے۔
میرے ذہن میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ تاثیر کے دماغ میں دیوداسی کے متعلق جو تصورات تھے ان کے پیچاق میں یہ بات بھی الجھی ہوئی تھی۔

گویا بمرور زماں دیوا داسی

اگر چہ دیوتاؤں کی کنیز نہ رہی تھی۔ شیطان کی باندی اور شیطنت کا آلۂ کار ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی اس نے نسوانیت کو برقرار رکھا تھا اور اس کی روح میں ایک اُجالا سا ضرور لرزتا رہتا تھا۔ ان امور کی صراحت کے بعد اب مختلف بندوں پر ذرا نظر ڈال لینی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے بند میں دوسرا مصرع:

دوہرا تہرا آنچل ڈالے

ذہن کو فوراً اس حقیقت کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ کہ دیوداسی ہر چند روز اپنے بدن کا سودا چکاتی ہے۔ جسماً عریاں کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی روح اور اس کے وجود باطنی پر گہرے پردے پڑے رہتے ہیں۔ یہ دوہرا تہرا آنچل وہ خطِ مدافعت ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں:

ناک میں بندی کان میں بالے
جگ مگ جگ مگ کرنے والے

حقیقت میں دیوداسی کی روح کی تاب ناکی کی علامتیں ہیں۔ یہ زیور نہیں امید کے وہ ستارے ہیں جو اس کے وجودِ باطنی کے اندر پوشیدہ ہیں۔ دوسرے بند ہیں:

مدھ ماتی متوالی آنکھیں
جوبن کی رکھوالی آنکھیں

نہایت پر اسرار اور بلیغ شعر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آنکھیں روح کا آئینہ ہیں۔ لطیف ترین جذبات کا اظہار آنکھوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ دقیق ترین باتیں آنکھوں ہی میں کہہ دی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہو تو پورا چہرہ

نکھرا نکھرا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ سپردگی کی تمام جسمانی اور ذہنی کیفیات بیشتر آنکھوں ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سپردگی روحانی ہو یا جنسی اپنے بلیغ ترین اظہار کے لیے آنکھوں اور نظروں ہی کو وسیلہ بناتی ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ سپردگی کے اور علائم و رموز نہیں ہیں۔ لیکن آنکھوں سے زیادہ بلیغ اور لطیف کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب چونکہ دیوداسی کی آنکھوں میں اجنبی اور سپردگی کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوتی جو روح کے مُسخر ہو جانے کی علامت ہے۔ اس لیے اس کی روشن، ذہین اور چمکتی ہوئی آنکھیں جوبن کی رکھوالی کرتی ہیں۔ حُسن کی پاسبان ہیں۔ دلبری کے رموز کی محافظ ہیں۔ آخری بند ہیں:

جمن کنارے پریم دوارے
برہ اداسی درشن پیاسی
دیوا داسی تن من ہارے
تنہا اپنے آپ کھڑی ہے
بُت بن کر چپ چاپ کھڑی ہے

جمن کنارے اور پریم دوارے پھر بلیغ ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ دیوداسی وہ تشنہ کام اور تشنہ لب راہرو ہے جو بظاہر دریا کے کنارے کھڑا ہے اور ہونٹ تر نہیں کر پاتا۔ پریم کی جمنا بہہ رہی ہے اور اُسے ایک قطرہ نصیب نہیں ہوتا۔ بھگتی۔ شانتی اور بھگتی کے دامن یعنی مندر میں اس کی روح مضطرب اور بے قرار رہتی ہے۔ اس سے زیادہ حرماں کا احساس اور کسے ہوگا اور یہی حرمان کا احساس ہے۔ جس کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ:

تنہا اپنے آپ کھڑی ہے

ظاہر ہے کہ یہ تنہائی ذہنی اور روحانی ہے۔ ورنہ یوں تو صبح و شام دیوداسی سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہوگا۔

اپنے آپ کھڑی ہے

کا ٹکڑا وضاحت سے کہتا ہے کہ وہ صرف اپنے سہارے کھڑی ہے۔ اس کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں۔ اس کو راہ بتانے والا کوئی نہیں اور ''بت بن کر چپ چاپ کھڑی ہے'' ساری نظم کی جان ہے۔ دیوداسی روز دیکھتی ہے کہ مندروں میں بُت جامد اور ساکت بت، پتھروں کے ٹکڑے۔ بے حس، بے زباں، خاموش کس عقیدت اور محبت سے پوجے جاتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ ایک تصور کی علامت ہیں اور ذہن انسانی اس پتھر کے ٹکڑے سے ماورا ہو کر اس تصور تک پہنچتا ہے جس کی وہ علامت ہیں۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ کسی انسان کا ذہن اس بت کی تابندہ روح کو نہیں دیکھ سکتا جسے دیوداسی کہتے ہیں یہ بت پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ ذی حس ہے۔ جاندار ہے۔ روح رکھتا ہے۔ پھر بھی اس کی پوجا کوئی نہیں کرتا۔ لوگ ماورائے طبیعات تصورات کو چھو لیتے ہیں اور دیوداسی کی روح کو کوئی نہیں چھو پاتا۔ یہ کیا قیامت ہے، یہ بت جس کے اندر روح تابندہ ہے کب تک اپنے پجاری سے محروم رہے گا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ بیسویں صدی میں انسانیت کے بہت سے اخلاقی، تمدنی اور اقتصادی اقدار ایک کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید انکشافات کے باعث انسان کا شعور نہ صرف اپنی ذات کے متعلق گہرا ہو گیا بلکہ وہ فطرت کے مظاہر و رموز سے بھی نسبتاً بہت زیادہ آگاہ ہو گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد تک ابھی تک نیا تمدنی مزاج متعین نہیں ہو سکا تھا۔ سائنس، طب اور نفسیات میں تیزی سے ایسے انقلاب انگیز انکشافات ہو رہے تھے کہ یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ اب چشم تماشا کی لذت دگر کا کیا عالم ہو گا۔ پرانی معاشرت پر نہ صرف شکست و ریخت کا عمل جاری ہو چکا تھا۔ بلکہ وہ ایک نئے سانچے میں بھی ڈھل چکی تھی۔ اگر چہ سانچے برابر

بدل رہے تھے اور معاشرت نت نیا روپ اختیار کر رہی تھی۔ ان حالات میں شعر کی پرانی اور کلاسیکی روایات قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ زندگی اور زندگی کے کوائف پیچ دار ہو گئے تھے۔ بنیادی مسائل چاہے وہی ہوں لیکن ان سے شاخیں اتنی پھوٹ نکلی تھیں۔ گویا مسئلے کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ اس کے باوجود تاثیر کے زمانے کے کچھ شاعر ایسے اس طرح شعر کہتے جا رہے تھے گویا نہ اقتصادیات میں کوئی انقلاب برپا ہوا نہ معاشرے کا مزاج بدلا ہے نہ تمدن کی اقدار تغیر پذیر ہوئی ہیں۔ ان لوگوں کو تو تاثیر نے درخور اعتنا نہیں جانا کہ اظہار مطالب میں دیانتداری بھی نہیں برتتے تھے۔ البتہ اس نے جدید معاشرے کے پیچاک کو دیکھ کر پرانی معاشرت کی سادگی کو یاد کیا اور ان شعراء پر رشک کا اظہار کیا جن کے مسائل نہایت سادہ اور جن کی زندگی خوب تکی بندھی تھی۔ یہ نظم جس کا عنوان ہے ''اگلے وقتوں کے شاعران کرام'' طنز کا بھی ایک کامیاب نمونہ ہے اور بیسویں صدی کے شاعر کے ذہنی تذبذب کی بھی نہایت اچھی تصویر ہے۔ کسی نقاد نے جنگ عظیم کے بعد دنیا کی جو حالت ہو گئی تھی اُسے Leaning Tower of Pisa سے تشبیہ دی تھی کہ گرتا بھی نہیں اور جھکا ہوا بھی ہے۔ مراد یہ تھی کہ پرانی معاشرت کہیں ختم بھی ہو چکے تو آدمی اپنے آپ کو نئے تمدنی مزاج کے سانچے میں ڈھال لے۔ لیکن ہو یہ رہا تھا کہ نہ پرانی دیواریں گرتی تھیں نہ نئی عمارت تعمیر ہوتی تھی۔ تاثیر کہتا ہے:

کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے	اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
رات دن نغمہ ہائے چنگ و رباب	روز و شب گردشِ پیالہ و جام
ایک جانب رقیب بدکردار	ایک پہلو میں ساقیِ گل فام
پھول تھے پھول، کانٹے کانٹے تھے	دانہ دانہ تھا اور دام تھا دام
ربط تھا زندگی کے حصے میں	ابتداء تھی الگ، الگ انجام

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام　　کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
شب مہتاب پائے ساقی پر　　اپنا سر رکھ کے خوب سوتے تھے
صبح دم قطرہ ہائے شبنم سے　　موتیوں کی لڑی پروتے تھے
پھول کو دیکھ کر چہکتے تھے　　اور بلبل سے مل کے روتے تھے
کاٹتے تھے فراق کی راتیں　　اور الفت کے بیج بوتے تھے
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے　　اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
آج دنیا کو وہ قرار کہاں　　زندگی ہے کہ ساغرِ سرجوش
مغ بچے عابدانِ صُبحہ بدست　　مسجدوں کے امام بادہ فروش
رات سے دن کا امتیاز محال　　صبح صادق ہے شام در آغوش
پھول اُلجھے ہوئے ہیں کانٹوں سے　　بلبلیں پھر رہی ہیں دام بدوش
گا رہے ہیں طیور شاخ بہ شاخ　　اور تاثیر سُن رہا ہے خموش
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام　　کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے

وہ نظم جس کا عنوان ہے ''ید بیضا'' تاثیر کی عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے۔ میں اس مختصر سے دیباچے میں اس حسین وجمیل نظم سے متعلق وضاحت سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس نظم کا نہ صرف پس منظر بہت عظیم ہے بلکہ ان الفاظ کے پردے میں محسوسات کا ایک دفترِ عظیم پنہاں ہے۔ اس نظم کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا جائے۔ مجھے مہلت نصیب ہوئی تو میں ایک علٰیحدہ مقالے میں اس نظم کے بارے میں اپنے احساسات کو پیش کروں گا۔ فی الحال میں صرف یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تاثیر نے اس نظم کی توضیح سے متعلق اسی نظم کے ساتھ ایک تمہید قلم بند کی ہے لیکن میں ان کی وضاحت سے مطمئن نہیں۔ شاعر خود کبھی اپنی عظمت کی پیمائش نہیں کر سکتا اور تاثیر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس نے ایک ایسی عدیم النظیر نظم لکھ دی ہے جو اربابِ نظر کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے

گی۔اُردو زبان میں اتنی عمیق اور جامع نظم آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ میرا خیال ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنے اس خیال کی تائید میں اپنے آئندہ مقالے میں دلائل پیش کر سکوں گا۔ میری دانست میں تاثیر اگر صرف یہی ایک نظم لکھ کر ہم سے رخصت ہو جاتا تو پھر بھی اُردو زبان کے ممتاز ترین شعراء میں اس کا شمار ہوتا۔ تاثیر کو فنونِ لطیفہ سے خاص شغف تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ جمالیات کی تحقیق و تدقیق میں صرف کیا۔ فنکار کی عظمت شوکت ان کے دل و دماغ میں موجود تھی چنانچہ اپنے اکتساب کے تمام افکار حسین کو انہوں نے اس نظم میں سمویا ہے۔ اس نظم کی حسین علامتیں خوب صورت استعارے اور دلنشیں کنائے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تاثیر اپنے افکار کو مختلف جمالیاتی علامات کے ذریعے ظاہر کر رہے ہیں۔ موسیقی، تصویر کشی، سنگ تراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی علامات و تشبیہات اس نظم میں اس طرح توضیح مطلب کے لیے استعمال کی گئی ہیں کہ ان کی نظیر اُردو میں نظر نہیں آتی۔ مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا جب تک میں ''ید بیضا'' پر اپنی مفصل رائے ظاہر نہ کر دوں اور اس کے لیے وقت کی ضرورت ہے اگر میرے چند احباب کو یہ شکایت ہو کہ میں اس دیباچہ میں تاثیر کی عظمت کے سارے نقوش پیش نہیں کر سکا تو یہ بجا ہو گا کیونکہ تاثیر کی شخصیت کے پہلو اس قدر متنوع تھے کہ ایک فردِ واحد ان سے مشکل ہی سے انصاف کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر تاثیر کی نثر نگاری

''عزیزم کے نام''(مکاتیب)

اپنے کیمبرج میں قیام کے دوران ڈاکٹر تاثیر نے اپنے عزیز شاگرد محمود نظامی کے نام جو خطوط تحریر کیے ان کے مجموعے کو مکتوب الیہ نے عزیزم کے نام سے شائع کیا۔ ان خطوط کی کل تعداد بائیس ہے۔ ان تمام مکتوب میں ڈاکٹر تاثیر نے محمود نظامی کو عزیزم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ محمود نظامی ان دنوں اسلامیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور بزم فروغ اردو کے سیکرٹری، یہ خود صاحب طرز ادیب ہیں اور ان کا ایک سفرنامہ ''منظر نامہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر بڑے مردم شناس تھے انہوں نے محمود نظامی کو بطور شاگرد کے ملاقاتوں میں پہچان لیا تھا کہ ان کے اس طالب علم میں آگے بڑھنے اور نام پیدا کرنے کی اہلیت ہے۔ محمود نظامی نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی اختیار کی اور مختلف جگہ پر ملازمت کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹیشن ڈائریکٹر بنے جہاں انہوں نے بطور براڈ کاسٹر کے بہت بڑا نام پایا۔ ڈاکٹر تاثیر کا انتقال تو ۱۹۵۰ء میں ہو گیا مگر نظامی صاحب نے بطور سٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان، لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کو اس طرح سے یکجا کیا اور ریڈیو پاکستان کو لاہور کی ثقافت اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایسا مرکز بنایا کہ ان کے دور کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ اپنی مقناطیسی شخصیت اور اپنے محترم جلیل القدر استاد کی تربیت کے زیر اثر انہوں نے لاہور سٹیشن کو دلی کے ریڈیو سٹیشن کا ہمسر بنا دیا۔ بعد میں نظامی صاحب مختلف

مراحل طے کرتے ہوئے ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بنے جہاں کراچی میں نہایت کسمپرسی کے عالم میں دل کے دورے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ حمید نسیم نے اپنی کتاب ناممکن کی جستجو میں نظامی صاحب کی شخصیت کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کا یہ ہونہار شاگرد اپنے استاد کی طرح غیر متوقع طور پر موت سے ہمکنار ہوگیا۔

محمود نظامی ان خطوط کو جن کی کل تعداد بائیس ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی زندگی میں چھاپنا چاہتے تھے مگر بوجوہ ڈاکٹر تاثیر کی خواہش تھی کہ انہیں ان کی زندگی میں نہ چھاپا جائے۔

بقول ریاض قدیر:

''ڈاکٹر تاثیر کے ذہن میں مشاہیر کے خطوط کا ایک اونچا معیار موجود تھا اور وہ نظامی کو لکھے ہوئے خطوط کو ذاتی نوعیت کی تحریریں سمجھتے تھے اور انہیں اپنی علمی اور ادبی شہرت اور شناخت کا حوالہ نہ سمجھتے تھے۔ یہ خطوط کوئی ڈیڑھ برس کے عرصے میں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان تحریر کیے گئے ان خطوط میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنے زمانے کے علمی اور ادبی ماحول کی مکمل عکاسی کی ہے کیمبرج کی علمی فضا، یورپ کے انداز تعلیم، اور اساتذہ کی فاضلانہ اور عالمانہ شخصیات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں یہ خطوط کیمبرج کی سرگرمیوں اور ان دنوں میں لندن کی علمی اور ادبی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت کا پرتو بھی ہے۔ جیسا کہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ خطوط نہایت ذاتی انداز میں لکھے گئے تھے اور ان میں ڈاکٹر تاثیر نے مختلف معاملات پر کھل کر اپنی آرا کا اظہار کیا ہے مقامی علمی اور ادبی انجمنوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے، جو ان خطوط کی ادبی افادیت میں گرانقدر اضافہ کرتا ہے۔

’’مقالاتِ تاثیر‘‘

اٹھانوے (۹۸) علمی ادبی سیاسی اور متفرق مقالوں پر مشتمل یہ مجموعہ مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ اسے ممتاز اختر مرزا نے مرتب کیا۔ پیش کلام اردو کے معروف ادیب احمد ندیم قاسمی کا تحریر کردہ ہے۔ اس مجموعہ کے دیباچہ میں ڈاکٹر تاثیر کے مختصر حالات زندگی شامل ہیں۔ جناب حمید احمد خان کا مضمون ’’تاثیر زندہ باد‘‘ بھی اس میں آغاز میں شامل ہے جو انہوں نے 1519ء میں ’’کریسنٹ‘‘ کے لیے تحریر کیا تھا۔ دیباچے میں ممتاز اختر مرزا تحریر کرتی ہیں۔

’’ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کے مقالات کا زیر نظر مجموعہ ان کی ایسی ادبی تحریروں پر مشتمل ہے جو ان کی ادبی زندگی کے آغاز یعنی 1918ء سے لے کر ان کی وفات ۱۹۵۰ء اور اس کے چند سال بعد تک مختلف ادبی مجلوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہیں۔
ان رسائل میں ’’نیرنگ خیال‘‘ سرفہرست ہے۔ تاثیر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک اس ماہنامے کے نائب مدیر رہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلو نہ ہوگا کہ ان کا اسلوبِ تحریر اس ماہنامے سے وابستگی کے زمانے میں نقطۂ عروج پر تھا۔ علمی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں موضوعات میں تنوع آتا گیا چنانچہ فلسفہ البنات سے لے کر حالات حاضرہ کے

مسائل تک ڈاکٹر تاثیر کے قلم کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۸۱ء سے
۱۹۴۷ء کے درمیان ربع صدی کا ایک ایسا زمانہ بھی آیا جس میں
لاہور ہندوستان بھر میں تخلیقی ادب کا مرکز تصور ہونے لگا اس دور کو
رسائل اور جرائد کا دور بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اظہار کی اکثریت نے
ابلاغ کی مختلف صورتیں بھی از خود مہیا کر دی تھیں۔ اس دور کے جرائد
میں ''مخزن''، ''نیرنگ خیال''، ''عالمگیر''، ''شاہکار''، ''ادبی دنیا''،
''کارواں''، ''نرگس''، ''قوس قزح'' اور بعد میں ''ماہ نو'' ''آج کل''
اور ''نقوش'' کے نام قابل ذکر ہیں۔

تاثیر کی نگارشات ان میں سے اکثر مجلوں کی زینت بنتی رہیں۔ وہ
اپنے نام کے علاوہ فرضی ناموں سے بھی لکھتے تھے ان ناموں میں سے
ایک نام نظامی قدوسی تھا روایت کے مطابق ایک نام ''مفکر'' بھی تھا۔
جو کبھی کبھی وہ اپنی انگریزی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ صحافت
کے معرکوں میں بقول آفتاب احمد خان: ''ڈاکٹر حجازی'' کے نام سے
آئے تھے اور فکاحیہ شاعری میں کبھی کبھی فتو لہار کے نام سے طبع
آزمائی کرتے تھے۔ اول معرکے اور ادبی مجادلے ڈاکٹر تاثیر کی
شخصیت کے اہم جزو تھے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور ڈاکٹر تاثیر
کے ادبی معرکے اس ضمن میں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(دیباچہ "مقالات تاثیر" از ممتاز اختر مرزا: اقتباس)

''مقالاتِ تاثیر'' میں دیباچے کے بعد ایک اور مضمون جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے شامل
ہے جو ڈاکٹر تاثیر کے شاگرد رشید حمید احمد خان نے ''کریسنٹ میگزین'' کے لیے ۱۹۵۱ء

میں تحریر کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے، ''تاثیر زندہ باد''۔ یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے ڈاکٹر تاثیر کی وفات کے کوئی ایک ڈیڑھ برس بعد شائع ہوا۔

حمید احمد خان لکھتے ہیں:

'' ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت میں دو ایسے کمال جمع ہو گئے تھے جو صرف بڑے آدمیوں کی ذات میں جمع ہوئے ہیں۔ ایک تو ان کا وہ تخلیقی جوہر جو محض خوبیِ تقدیر سے ان کے حصے میں آیا دوسرے اس خلقی جوہر کو اپنی کاوش اور کوشش سے فروغ دینے کی وہ غیر معمولی استعداد جو تقدیرِ خداوندی پر تدبیر کے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ فطری اکتسابی پہلو محض مفرد عنصر نہ تھے جس طرح ان کا اکتساب ہمیشہ بوقلموں تجربات کی جستجو میں رہا اسی طرح ان کی طبیعت کا خداداد جوہر بجائے خود دو بظاہر متضاد کیفیتوں سے مرکب تھا۔ میں نے بظاہر کا لفظ دانستہ استعمال کیا ہے اور احتیاط سے اس لیے کہ دراصل ان دو کیفیتوں میں کوئی تضاد نہ تھا۔ فرق اور واضح فرق البتہ ان کیفیتوں کے درمیان موجود تھا۔ ان میں سے ایک تو ان کی لامحدود فراست تھی۔ ہر وقت بیدار ہر وقت خبردار فراست دوسرے ان کی لذت پسندی اور لذت طلبی یہ دو نقطے گویا ان کی عقلی اور حسی فطرت کے محور تھے کیفیت کے بنیادی فرق کے باوجود یہ دونوں مضطرب بلکہ طوفانی نقطے بالحاظ شدت ایک پر تھے اور ان کا اشتراکِ عمل حیرت انگیز تھا۔''

(تاثیر زندہ باد: حمید احمد خان)

ایک جگہ حمید احمد خان لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر تاثیر کی زندگی کے آخری دو سال اور اس مختصر مدت کے مہینے ہفتے اور دن رات نئی تعمیر کی سعیٔ مسلسل کے لیے وقف ہو گئے۔ پاکستان کا سیاسی نظام، تعلیمی نظام، مذہبی نظام پاکستان کی صحافت اور نیا ادب اور فنون لطیفہ سبھی ڈاکٹر تاثیر کے ان تھک نوائے فکر و عمل، ڈاکٹر تاثیر کی بے نظیر اداشناسی اور معاملہ فہمی سے بہرہ مند ہوئے۔ اس حیرت انگیز انسان کا اعجاز یہ تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہنستے کھیلتے کہانیوں کہا جیسے بڑے کارنامے سرانجام دینا۔ اس کے معمولات زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ کسی شخص نے اسے کمر کستے، سینہ تانتے، مٹھی بھینچتے ہوئے نہیں دیکھا، مشاعرے اور دوستوں کے میلے، کتابیں تصویریں نغمے اور قہقہے کی فضا تھی۔ جس میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنی زندگی کا بلند ترین اور بہترین کام کیا۔''

(تاثیر زندہ باد حمید احمد خان)

تاثیر زندہ باد کے اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ڈاکٹر تاثیر کے سامنے تعمیر وطن کی منزل آ گئی تھی۔ ان کے لیے مانگے تانگے کے چراغوں سے محفل کو روشن کرنا قطعی غیر ضروری تھا۔ تعمیر پاکستان کے لیے اشتراکی آب و گل مستعار لینا اب ڈاکٹر تاثیر کے نزدیک فلسفۂ پاکستان کی نفی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جن میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنا رخ موڑا اور اشتراکیت کے فلسفے سے روگردانی کر کے قائداعظمؒ کے نصب العین پر عمل پیرا ہوئے۔ اشتراکی فلسفے نے ایک مرحلہ پر جیسا کہ حمید احمد خان نے تحریر کیا ہے:

''ہر حساس اور صاحب فرد نوجوان کو متاثر کیا تھا مگر اشتراکی فلسفے کی

روشنی آنکھوں کو چندھیانے والی روشنی تھی جب کہ قائداعظمؒ نے اپنے
نور بصیرت سے راہ زیست کو روشن کیا۔ یہ نور آنکھوں پر پڑنے کی
بجائے قائداعظمؒ کے دکھائے ہوئے راستے پر پڑتا تھا اور راستے کو
منور کرتا چلا جاتا تھا۔''

''مقالاتِ تاثیر'' کو مرتب نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی موضوعات کے اعتبار سے ورنہ یہ سب مختلف ادوار میں تاریخی لحاظ سے آگے پیچھے لکھے گئے تھے۔ یہ تقسیم کچھ اس طرح ہے:

۱۔ قومی مسائل

اس حصے میں وہ مقالے شامل ہیں جن میں پاکستان کی ثقافت کا مستقبل، خارجی تعلقات ادیبوں کے فرائض جیسے موضوعات پر تحریریں شامل ہیں۔

۲۔ اقبالیات

یہ مقالہ جات فلسفہ اقبال، اقبال کے نظریۂ ادب وفن ان کی شاعری اور ان کے پیام کے بارے میں ہیں۔

۳۔ فنون لطیفہ

اس حصے میں سٹیج، مصوری اور فوٹو گرافی آرٹ کی ابتداء، آرٹ اور زندگی جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

۴۔ ادبی مسائل

اس حصے میں ادب اور اس سے متعلقہ مسائل پر لکھا گیا ہے ان مقالات میں غالب کی شاعری سے لے کر اُردو شاعری کے نئے رجحانات، اُردو میں ترقی پسندی اور اشتراکیت، ترقی پسند ادب تخلیق شعر کا مسئلہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

۵۔ نقد و نظر

یہ حصہ شعر و ادب پر تنقید کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں غالب سے لے کر میرا جی تک اور اقبال سے لے کر اختر لکھنوی تک مختلف شعرا کے کلام سے بحث کی گئی ہے۔ اُردو نثر کے شاہکار بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

۶۔ غیر ملکی ادب

ڈاکٹر تاثیر کا تعلیمی پس منظر ایسا تھا کہ انہیں غیر ملکی ادب خصوصی طور پر انگریزی ادب مطالعہ کرنے کا بدرجہ اتم موقع ملا۔ ایک تو ان کا اپنا شوق مطالعہ دوسرے کیمبرج میں پی ایچ ڈی کے سلسلے میں قیام کی وجہ سے غیر ملکی مصنفین کو پڑھنا ان کے مقالے کے سلسلے میں بھی ضروری تھا۔

۷۔ اداریے دیباچے

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس حصے میں ڈاکٹر تاثیر کے تحریر کردہ اداریے اور دیباچے شامل ہیں۔

۸۔ سیاسیات

اس حصہ میں مختلف سیاسی موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے جس میں انگریز کی جنگ اور ہندوستان کی آزادی جیسے موضوعات شامل ہیں۔

۹۔ متفرقات

ان مقالات میں مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جو مرتب کسی خاص حصے میں شامل نہ کر سکے چنانچہ انہیں متفرقات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ان مقالات میں ان کی کیمبرج کی مصروفیات لندن کی ادبی محفلیں کسب معاش جیسے موضوعات پر مقالات تحریر کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کے تحریر کردہ ''مقالات'' جو زیر نظر کتاب میں شامل ہیں اس قدر متنوع اور مختلف النوع ہیں کہ مثالی صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو پڑھا جائے لیکن کتاب کی ضخامت کے پیش نظر شاید قارئین کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ بہر کیف چونکہ معاملات کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دے دیا گیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منتخب مقالات کے اقتباسات تحریر کر دینے چاہئیں جن سے قارئین کو ڈاکٹر تاثیر کے زور بیان طرز تحریر اور منطقی انداز فکر سے شناسائی ہو جائے گی۔

"مقالاتِ تاثیر" سے اقتباسات

"پاکستان میں کلچر کا مستقبل"

اس مقالے میں ڈاکٹر تاثیر نے پاکستان میں ثقافت کے مستقبل پر بحث کی ہے۔ یہ مسئلہ تو خیر اب تک حل نہیں ہو سکا کہ ہماری ثقافت کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ اور کیا آزادی کے بعد پاکستانی ثقافت کو مکمل طور پر اسلامی کیا جا سکتا ہے یا ہمیں کسی نہ کسی شکل میں اپنے ماضی سے جو خواہ وہ ہندوستان میں طلوعِ اسلام سے قبل کا ہو رابطہ رکھنا پڑے گا۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی نظریاتی سلطنت ہے اس لیے اس قسم کے سوالات ہمارے ثقافتی پس منظر کو متعین کرنے کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ ۱۹۴۸ء میں تحریر کیا گیا جب پاکستان کو بنے ہوئے ایک سال گزرا تھا اور اس نوزائیدہ مملکت میں ثقافت کے حوالے سے مختلف النوع سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر رقص و موسیقی کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں:

> "سب سے پہلے موسیقی کو لیجئے: جب اسلام نے سماجی حیثیت سے ہندوستان میں جڑیں پکڑیں تو موسیقی کی یہ حالت تھی کہ ایک طرف اسے محض قواعد و ضوابط کی پابندیوں نے جکڑا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف وہ دیوداسیوں اور اربابِ نشاط کی کنیز بن گئی تھی۔ مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اسے مذہبی اور

روحانی تجربے کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ شوقین مزاج سرپرستوں نے
اسے دنیاوی رنگ دیا اور زندگی کے قریب لا کے امیر خسرو کی تخلیقی
فطرت نے ان دونوں چیزوں میں بہترین امتزاج پیدا کیا لیکن
مسلمانوں کی تمدنی زندگی کے زوال کے ساتھ موسیقی میں بھی زوال
آ گیا۔ انگریزوں کے لیے راگوں کی موسیقی بالکل اجنبی تھی اس لیے
موسیقی ان کی سرپرستی حاصل نہ کر سکی۔ ہندو احیا کی تحریک سے موسیقی
پھر ہندو سماج میں داخل ہو گئی گو اس فن کے ممتاز ماہرین مسلمان ہی
تھے لیکن مسلمانوں نے سماجی حیثیت سے اسے قبول نہ کیا۔ پھر مغلوں
کا زمانہ آ گیا اب موسیقی کی سرپرستی اکا دکا امیروں کے ہاتھ میں نہیں
بلکہ عوام کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ لیکن سرپرستی اتنی براہ راست نہ تھی کہ
اس سے فوری نتیجے برآمد ہو سکتے۔ اب متمدن لیکن زوال پذیر
شاہزادوں کی جگہ موسیقی کے سیاہ سفید کا مالک مارواڑی بن گیا اور جیسا
کہ آلڈس ھکسلے نے کسی اور موقع پر اس سلسلے میں کہا یہ محض ابوالہوسی
کی تسکین کا آلہ کار بن کر رہ گئی۔ اس میں صرف سفلی جذبات کا اظہار
ہوتا ہے اور حالات کا جو اندازہ اس وقت ہو سکے اسے دیکھتے ہوئے یہ
توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس انداز میں نیا کوئی انقلاب پیدا ہو سکے گا۔
اس سلسلے میں حکومت کچھ مدد کر سکتی تھی مگر جن کے ہاتھوں میں حکومت
کی باگ ڈور ہے اور کاموں میں لگے ہوئے ہیں پھر یہ بھی ضروری
نہیں ہے کہ آرٹ کے معاملے میں ان کا ہر فیصلہ صحیح ہو اس لیے اگر ہم
موسیقی کو نئی زندگی دینا اور اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ

موسیقی کے کالج اور اکیڈمیز قائم کی جائیں۔ یہی طریقہ رقص کو زندہ رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے لیکن شاید اس سلسلے میں ارباب حل و عقد کو بعض گروہوں کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ ہو اس لیے رقص کا فن چند برسوں کے لیے یونہی پستی کی طرف بڑھتا رہے گا حالانکہ ہم شاید یہ نہیں سوچتے کہ پاکستان کے بعض جنگل قبیلوں اور دیہاتی کسانوں میں لوگ رقص کو زندگی کی ایک بامعنی اور توانا ضرورت سمجھتے رہے ہیں۔ بے شک دنیا میں رقص و سرور کی بیسیوں قسمیں ہوں لیکن ہم پاکستانیوں کو اپنی فنی روایات کی تشکیل جرأت کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ہمیں اس فن کو پستی سے بچانا چاہیے اور اسے اس طرح نئی زندگی دینی چاہیے کہ وہ ہماری سماجی ترقی میں ممد ہو۔"

(ماہ نو خاص نمبر ۱۹۴۸ء: "مقالات تاثیر")

اس اقتباس کا ایک تو قارئین کو یہ دکھانا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے ثقافت کے ایک الجھے ہوئے مسئلے پر کس سادگی اور دانائی سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ مسئلہ اب بھی نزاعی ہے مگر ڈاکٹر تاثیر نے اس پر اپنے خیالات کا واضح اظہار کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۴۸ء میں یہ بات کہنی اتنی آسان نہیں تھی مگر جب خلوص نیت ہو تو مشکل سے مشکل بات نہایت سادگی سے کہی جا سکتی ہے۔ دوسری خاص بات اس میں دیکھنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر ایک جید عالم تھے لیکن اس مقالے کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں بات کہی گئی ہے۔ ان کے مخاطب خواص میں عوام تھے۔ ان کے انداز تحریر نے ان کے پیغام کو پراثر اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ یہی بات اگر ثقہ عالمانہ انداز میں کہی جاتی تو عوام کو نہ صرف سمجھنے میں دقت ہوتی بلکہ اس پیغام کا جو بنیادی مقصد ہے وہ بھی فوت ہو جاتا۔

''آرٹ اور زندگی''

''آرٹ اور زندگی'' کے عنوان سے ڈاکٹر تاثیر کا ایک انٹرویو'' چٹان'' میں چھپا تھا۔ یہ ڈاکٹر تاثیر کی موت کے بعد شائع ہوا اس انٹرویو میں سے چند سوال قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں جن کے جواب سے ڈاکٹر تاثیر کی ذہنی بلوغت اور ان کے مخصوص نکتہ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ فن برائے فن اور فن برائے زندگی پر بے شمار مضامین ان دنوں میں شائع ہوئے تھے کیونکہ پاکستان بننے کے بعد قوم جس ابتلا سے گزری تھی اور آگ اور خون کا جو طوفان اس نے دیکھا تھا۔ اس نے بہت سے معاملات کو کم از کم عارضی طور پر پوری نسل کے لیے بے معنی کر دیا۔ زیر نظر انٹرویو میں آرٹ اور زندگی کے باہمی ربط کے بارے میں چند سنجیدہ سوال اٹھائے گئے ہیں۔

سوال: آرٹ کو زندگی سے مربوط ہونا چاہیے۔ اقبال اور چغتائی، ماضی کے متعلق اسقدر انہماک کیوں رکھتے ہیں۔ کیا یہ زندگی سے روگردانی نہیں؟

جواب: آرٹ جملہ فنونِ جمیلہ، ادبیات سب زندگی بخش زندگی افزا ہونے چاہئیں۔ فقط مربوط ہونا کافی نہیں ہے اور زندگی عبارت ہے دل زندہ سے آرزو کی تازگی سے جس آرٹ میں آرزوئے حیات بڑھتی ہے آرٹ زندہ ہے تصویر میں'' شاہجہاں''، '' سٹالن''، ''ہٹلر''، ''فتو لہار'' یا '' ڈالمیا'' کی شبیہ کا ہونا اسے زندگی سے دور یا نزدیک نہیں کرتا۔ ماضی حال مستقبل وقت کی اعتباری تقسیم ہے۔ روایات کا تواتر آرٹ کا بنیادی جزو ہے۔ تہذیب و تمدن کا تواتر اسی سے قائم ہے۔ ماضی سے روگردانی زندگی سے روگردانی ہے۔

سوال: چغتائی شاہانِ سلف کی تصاویر کیوں بناتا ہے؟ یہ رجعت پسندی ہے۔

جواب: رجعت پسندی یا ناپسندی آرٹ کی قدر نہیں ہے۔ آج کل روس میں وہ ظالم اور مستبد "زار" جنہیں عوام نے صدیوں سے مکروہ القاب دے رکھے تھے۔ نہ فقط وہاں کے آرٹ کے موضوع ہیں بلکہ سرکاری احتسان اور ستائش کے بھی موجب ہیں ایوان مہیب کو ایوان عظیم کہا جاتا ہے روس کا غلو قابل تقلید نہیں لیکن شاہانِ سلف کو بادشاہ ہونے کی بنا پر مردود قرار دینا معقول نہیں۔ اپنے عہد کے اعتبار سے بادشاہ اچھے بھی تھے برے بھی تھے۔ ان کی سرپرستی میں آرٹ اور ادب کی ترقی اور کارنامے قابل ستائش ہیں لوگ مسجد جامع کو بادشاہی مسجد یونہی تو نہیں کہتے۔ بہرصورت تصویر بنانے کے موضوع کا اختصاص بلکہ احتساب فنی رجعت پسندی کہلانے کے قابل ہے۔

سوال: چغتائی کی تصویروں میں جو عورتیں ہیں کیا ایسی عورتیں ہوتی ہیں؟

جواب: نہ ہوں تو پھر کیا ہوا کیا غزل کا معشوق ہوتا ہے وہ نقوش جو عورت سے مشابہ ہوں ان سے اقتصادی جسمانی عورت کا کام لینا آرٹ کا مقصود نہیں۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ ہم آرٹ کے کاروبار سے مانوس نہیں ہیں۔ غزل سے موانست کی وجہ سے شاعری کے فن سے مانوس ہونے کے سبب ہم اس فن کی تشبیہات، تلمیحات اور مبالغے کی سوجھ بوجھ تو رکھتے ہیں لیکن مصوری اور اس کے اثاثے سے نامانوس ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اصل تصویریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تصویریں سمجھنے کے لیے تصویروں کا بار بار دیکھنا ضروری ہے۔ شعر سمجھنے کا طریقہ شعر پڑھنا ہے تصویر سمجھنے کا طریقہ تصویر دیکھنا ہے درد، حافظ، غالب، اقبال، جو ہماری روایات کے شاعر ہیں ان کا کلام ہمارے پیش نظر ہوتا ہے اور یورپ کے شاعروں کا بھی یہی حال ادب کے دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔ لیکن مصوری

کے نمونے ہماری نظروں سے اوجھل ہیں قیمتی کتابوں میں کچھ نقول نظر آتی ہیں نظر بھی آ ئیں تو کیا ہوا نقل بہر حال نقل ہے۔ اصل رنگ اور خط کی زندگی اس میں کہاں اگر کوئی بدخط کاتب میر تبریزی کے کتبے کی نقل کرے کوئی نو وارد فرنگی اردو کا شعر اپنے لہجے میں بحر سے باہر سکتہ ڈال کر پڑھے تو اس سے جو اثر پیدا ہوتا ہے وہی تصویروں کی نقل سے ہوتا ہے۔ خصوصاً ان تصویروں کی نقول جو دلچسپ کہانیوں غیر متعلقہ تاثرات سے الگ ہو کر رنگوں اور خطوں کے آہنگ سے تخلیق ہوتی ہیں۔

فن کے سامنے ایک عبارت گزار کی طرح حاضر ہونا چاہیے۔ عقیدت اور ذوق وشوق سے سرشار ہو کر شاید کوئی نگاہ کارگر ہو جائے کوئی جھلک لذت حضوری سے فیض یاب کر دے۔ فن کار کے الہامی لمحوں کی یادگار میں ایک تخلیقی تقدس ہوتا ہے۔

قسمتِ بادہ با اندازۂ جام است انیجا

"اقبال کا نظریہ فکر و فن"

میرے سامنے زیر نظر ایڈیشن "بزمِ اقبال" کا شائع کردہ ہے اس سے قبل اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بزم اقبال کے طبع کردہ ایڈیشن کا پیش لفظ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے تحریر کیا ہے جبکہ تینوں ایڈیشنوں کے دیباچے جناب افضل حق قریشی نے لکھے ہیں جو اس کتاب کے مرتب ہیں۔

اقبال کا فکر و فن کے اب تک کے آخری ایڈیشن میں ڈاکٹر تاثیر کے انیس "مقالات" شامل ہیں جس کے پہلے تین مضمون ان یادداشتوں پر مبنی ہیں جو علامہ اقبالؒ کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے میاں نظام الدین سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ علامہ ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے ڈاکٹر تاثیر کی تعلیم و تربیت میں بھی علامہ کو بہت دخل تھا

انہیں کیمبرج بھجوانے کے لیے انہوں نے خصوصی خط دیا۔ ان کا مضمون ''شاعر مشرق کے حضور میں'' ان خصوصی تعلقات کا آئینہ دار ہے۔

''شاعرِ مشرق کے حضور میں''

''۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ میں، کیمبرج سے لاہور پہنچا سیدھا جاوید منزل کے آستانے پر حاضر ہوا۔ علامہ اقبالؒ گھر پر موجود نہ تھے میں حسب دستور بغیر اطلاع گیا تھا۔ کسی کا گھر پر موجود نہ ہونا حیرت ناک امر تھا۔ ۱۹۳۳ء میں انہیں الوداع کہہ کر گیا تھا اس عرصے میں یہ کیا انقلاب آ گیا کہ علامہ گھر سے باہر ہوں ملازم سے پوچھا، کہنے لگا، سیر کو گئے ہیں۔ یہ بات بھی تعجب خیز تھی کہ باہر گئے بھی ہیں تو سیر کے لیے۔ علامہ اقبالؒ کی سیر کا مجھے تجربہ تھا اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھایا کرتا تھا فارغ ہو کر میکلورڈ روڈ پہنچا۔ علامہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے ''ڈاکٹر تاثیر صاحب آپ بھی کبھی سیر کیا کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں سیر کرنا صحت کے لیے اچھا ہے۔''

میں مطلب سمجھ گیا۔ میں نے عرض کیا جی ہاں اگر آپ کا ارادہ ہو تو سیر کی جائے'' کہنے لگے ''مگر آج نہیں کل باقاعدہ نیت باندھ کر یہ کام کیا جائے۔ نیت کے بغیر تو نماز بھی نہیں ہوتی۔ نیت باندھنے میں بڑا نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس سے توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور نتائج جلد مرتب ہوتے ہیں۔ میں دوسرے دن مقررہ وقت پر حاضر ہوا۔ چالیس سے کچھ زیادہ قدم ہی چلے واپس آ کر مستقبل کے لیے باقاعدہ پروگرام

مرتب ہوا لیکن تیسرے دن سیر کی نوبت نہ آئی لوگ آ گئے یا کچھ اور
بات ہو گئی۔ ان دنوں علامہ اقبالؒ کی صحت اچھی بھلی تھی، نقرس کے
علاوہ اور کوئی عارضہ نہ تھا لیکن جاوید منزل میں عوارض کے باوجود سیر
کے لیے نکلنا عجیب معلوم ہوا۔ ملازم سے پوچھا، کب گئے تھے، کہنے
لگا، دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ مجھے مایوس سا دیکھ کر کہنے لگا، دس بارہ
منٹ میں آ جائیں گے۔ موٹر پر گئے ہیں چہل قدمی بھی نہ تھی ہوا
خوری تھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر آ گئی۔ وہ موٹر
سے نکل کر میرے برابر سے ہو کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے
مجھ سے بات بھی نہ کی۔ میں برآمدے میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ دو
منٹ کے بعد ننگے پاؤں باہر نکلے اور آبدیدہ ہو کر مجھے گلے لگا لیا۔
کہنے لگے "دیکھا اب میری آنکھ کام نہیں کرتی۔ مجھے تو بارہا خیال گزرا
تھا کہ جیتے جی ملاقات نہ ہو گی۔"

(شاعر مشرق کے حضور میں ۔ اقبال کا فکر و فن)

"اقبال کا نظریہ فن و ادب"

ڈاکٹر تاثیر نے اقبال کے نظریۂ ادب پر بحث کرتے ہوئے اس مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ
اقبال فن برائے فن کے قائل نہ تھے۔ اقبال کے نزدیک فن ایک سماجی فریضہ بھی ہوتا ہے۔
رسکن اور ٹالسٹائی کی طرح حالی فن میں مقصدیت کے قائل تھے یہ معنویت اقبال کو ورثے
میں ملی۔ اس مقالہ میں علامہ اقبالؒ کے حوالے سے ایک دلچسپ تجزیہ شامل ہے۔
"علامہ نے گفتگو کے دوران یہ بتایا کہ شعر کی آمد ایک الہامی کیفیت

کی طرح ہے جو آمد کی شے ہے آورد کی نہیں ۔ جونہی اس کیفیت کا
تجزیہ کیا جائے وہ الہامی کیفیت غائب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ
علامہ پر ''آمد شعر'' کوئی ایک برس تک رکی رہی چنانچہ انہیں یہ خیال
پیدا ہو گیا کہ انہیں شاعری کی شکل میں جو صلاحیت دی گئی تھی وہ واپس
لے لی گئی ہے۔ سو انہیں نثر پر کچھ کام کرنا چاہیے لیکن ایک رات جب
وہ ستاروں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے تو اشعار کی آمد اچانک
شروع ہو گئی چنانچہ وہ عارضی تعطل ختم ہو گیا اور اس کے بعد ایسی کیفیت
کبھی طاری نہیں ہوئی۔''

علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعری زندگی اور شخصیت کے تابع ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں:

''وہ اپنے تجربے کی نوعیت کو خوب سمجھتے ہیں اس لیے اپنے عقیدے
میں کہ شاعری زندگی کے تابع ہوتی ہے ایک اور کا اضافہ کیا وہ کہتے
ہیں شاعری زندگی اور شخصیت کے تابع ہوتی ہے۔ مادہ پرستی میں تو یہ
خطرہ ہے کہ شاعر جماعتی سیاست یا جامد نظریوں کا غلام بن کر رہ جاتا
ہے۔ لیکن اقبال نے شخصیت پر زور دے کر اپنے آپ کو اس خطرہ سے
بچا لیا انہوں نے سماجی زندگی کے لیے جو اقدار مقرر کیں، ان کا مرکز
بھی شخصیت کا مسئلہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں جو چیز خودی کو تقویت دے
اسے جاندار بنائے وہ سماجی اعتبار سے اچھی ہے۔ اچھی شاعری ایک
حساس شخصیت کا اظہار ہونے کی وجہ سے سماجی طور پر اچھی ہوتی ہے۔
فن کے لیے ضروری ہے کہ آرزو یعنی جینے کی خواہش پیدا کرے جس

فن میں یہ صفت ہو وہ اچھا ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مثالی فن کار کی روح آرزو کے خالص ترین جوہر یعنی عشق کے ذریعے حرکت میں آتی ہے۔ اور عشق حسن اور قوت کا مجموعہ ہے''

(اقبال کا نظریہ فکر و فن : اقبال کا فکروفن)

یورپی مفکر'' آئی۔اے۔ رچرڈ کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس میں ایک طرح کا بنجر پن ہے اس کے مقابلے میں اقبال نے حسن اور قوت کے توازن کا تصور پیش کیا ہے۔ جس میں تجربے کے قابل قدر ہونے سے بات نہیں بنتی اس کی ایک جذباتی سمت بھی ہونی چاہیے۔ لکھتے ہیں:

''اس'' سمت'' کی توضیح کرتے ہوئے اقبال نے فطرت پرستانہ نظریوں پر تنقید کی ہے۔ اس ضمن میں جو لفظ سب سے اہم ہے وہ قوت ہے انہیں یہ بات پسند نہیں کہ مرئی چیزوں کو غیر ہوئی چیزوں کا تشکیل دینے والا سمجھا جائے کیونکہ جیسا کہ انہوں نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہو جائے گا کہ انسان کی روح پر مادے اور فطرت کا مکمل اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''قوت فطرت کی تحریکات سے مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ ان تحریکات کے مقابلے میں بے دست و پا ہو جانے سے۔''

اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''صحت اور زندگی سے یہ مراد ہے کہ جو نہ موجود ہے اس کا مقابلہ کیا جائے تا کہ مثالی شے تخلیق ہو سکے۔ اس کے علاوہ ہر چیز انحطاط اور موت ہے۔'' اقبال کہتے ہیں کہ فن کار کو اپنی خودی کی گہرائیوں میں

مثالی شے دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مادی حقیقت یا
فطرت کو اس جستجو میں مداخلت کی اجازت نہیں دینی چاہیے بڑا فن کار
وہ ہوتا ہے جو اپنے دل میں "لا انتہا آرزو" رکھتا ہو۔"

(اقبال کا نظریہ فکر و فن : اقبال کا فکروفن)

"اقبال کا نظریہ شاعری"

ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہندوستان کی شاعری بیشتر داخل یا ذاتی شاعری تھی۔ اس شاعری کو وہ ایک طرح کی مصنوعی شاعری سمجھتے ہیں کیونکہ شاعر دنیا اور اس کی حقیقت اور دیگر مسائل نظر انداز کر کے ایک ایسی دنیا کا نقشہ کھینچ رہے تھے جو زیادہ تر خیال تھی۔ اسے خیال ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ دربار کی شاعری کی فضا تو یہی تھی روایات پرستی، رقیبوں اور پاسبانوں کا قصہ، گل و بلبل کا قصہ سب عرصہ سے چل رہا تھا اور چلتا ہی رہتا اگر حالی اور اقبال بیچ میں نہ آ جاتے۔ حالی کی مقصدیت اقبال تک پہنچی اور انہوں نے ادب اور زندگی کو ایک لحظہ کے لیے جدا نہ سمجھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کئی نقاد فن برائے فن کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔ مگر سب شاعر اور نقاد اس قسم کے نہیں ہوتے۔ جرمنی کے معتبر شاعر گوئٹے نے شاعری اور ادب کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ اپنے ماحول کا پورا پورا احساس اور اس کی زندہ ترجمانی کا نام ہے۔ گوئٹے تو زمانہ حال کا آدمی ہے۔ انیسویں صدی میں زندہ تھا ھومر اپنی مشہور رزمیہ نظموں کے آغاز میں دعا کرتا ہے کہ اسے حقیقت کی

ترجمانی کی توفیق عطا ہو۔ حقیقت کی ترجمانی، ماحول کا احساس صداقت کا اظہار! یہ ہے ادب کا مقصد۔ یہ وہ مقصد ادب ہے جس کا اقبال کو بہت جلد احساس ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ اقبال کے فلسفے اور نظام فکر میں بہت سے انقلاب آتے رہے مگر اس کا نظریہ شاعری ہمیشہ کے لیے یہی رہا۔۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اقبال نے ادب اور زندگی کو ایک لمحے کے لیے مختلف نہیں سمجھا۔ عاشقانہ تغزل اور داخلی شاعری سے خارجی شاعری جسے نہ جانے کیوں فلسفیانہ شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ ہے اقبال کے نظریہ شاعری کا ارتقا اور یہ ترقی اقبال کی شاعری کی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی شاعری کی تدریج اور ترقی کا خلاصہ ہے حالی کے وقت یہ بدعت بھی گئی اقبال نے اپنی شاعرانہ شخصیت سے اس بدعت کو اردو شاعری کا بنیادی اصول بنالیا۔''

(اقبال کا نظریہ ادب و فن : اقبال کا فکروفن)

''فن برائے فن'' یا ''فن برائے زندگی'' یہ بحث ایک عرصے سے ادب میں نزاع کا باعث ہے۔ اور اس پر مشاہیر ادب نے کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر نے علامہ اقبالؒ کے نظریہ فن وادب کے حوالے سے اس پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن اور زندگی کو ندی کے دو کنارے سمجھنا ایک غلط فلسفہ تھا ادب زندگی کا زندگی ادب کی محتاج اور نگران ہے باقی سب کچھ بحث برائے بحث ہے۔

ڈاکٹر تاثیر اور نیاز مندان لاہور

یہ ادیبانہ چپقلش جو نیاز مندانِ لاہور اور اہلِ زبان کے درمیان شروع ہوئی بنیادی طور پر پنجابی ادیبوں کی طرف سے اس بات کا اظہار تھا کہ زبان پر فقط دلی اور لکھنوی حضرات کا اجارہ نہیں ہے بلکہ پنجاب کے ادیب بھی ابلاغ و اظہار میں ایسے ہی مشاق ہیں۔ پنجاب کے ادیبوں کی طرف سے جو بہت پیش پیش تھے ان میں پطرس بخاری، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور حفیظ جالندھری شامل تھے جبکہ اہلِ زبان کی طرف سے تاجور نجیب آبادی، وقار انبالوی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی اور احسان دانش تھے۔ اس ادبی معرکہ میں دونوں طرف سے غلو سے کام بھی لیا گیا۔ دونوں طرف کے احباب چونکہ اخباروں اور رسالوں سے بھی منسلک تھے اس لیے یہ معرکہ آرائی اخبارات کے صفحات کی زینت بنتی اور رسائل میں جگہ پاتی۔ قارئین دونوں طرف کے چٹکلوں اور ایک دوسرے پر کی ہوئی چوٹوں سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ چپقلش مشاعروں میں بھی جگہ پا گئی اور اشعار میں بھی ذو معنی باتوں سے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جاتی۔

حفیظ جالندھری اگر چہ بڑے پائے کے شاعر تھے مگر ان کی تعلیم واجبی سی تھی وہ اہلِ زبان کا خصوصی ہدف تھے۔ ان کا دفاع کرنے کے لیے نیاز مندان لاہور ہر دم تیار رہتے۔ حتیٰ کہ حفیظ کو یہ کہنا پڑا کہ

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اسی زمانے میں ڈاکٹر تاثیر نے حفیظ کی شاعری پر مضمون تحریر کیے اور ان کے شعروں کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر تاثیر قلم کے ایسے دھنی تھے اور تحریر میں ایسی کاٹ تھی کہ مخالفین اپنے زخم سہلاتے رہ جاتے۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کے بارے میں ''ساقی'' میں چھپنے والے ایک مضمون ''انارکلی پر ایک نظر'' کا نیازمندان لاہور کی طرف سے بڑا مدلل اور جامع جواب وہاں جو نیرنگ خیال میں شائع ہوا یہ مضمون اور اسکا جواب دونوں خاصے کی چیزیں ہیں کہ ان کا لطف فقط پڑھ کر اٹھایا جا سکتا ہے۔ انارکلی اور ''ہم نیازمند'' کے عنوان سے جو جوابی مضمون لکھا گیا تھا وہ بنیادی طور پر ڈاکٹر تاثیر کی کاوش تھی کہ تحریر کا اسلوب پتہ دیتا ہے کہ اسے کس نے تحریر کیا ہے۔

بنیادی طور پر اہلِ زبان کی طرف سے اعتراض یہ تھا کہ پنجاب کے ادیب صحیح اور درست اردو نہیں لکھتے۔ اب پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت ایسے اہل علم تھے جن کی زبان پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ پنجاب کے ادیبوں نے خم ٹھونک کر اہل زبان کا مقابلہ کیا اور ان کی برتری کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے انہیں احساس دلایا کہ زبان و بیان کے علاوہ وہ ادب میں کس قسم کی غلطیوں پر مرتکب ہو رہے ہیں۔ مثلاً ڈرامہ ''انارکلی'' پر چھپنے والے مضمون ''انارکلی پر ایک نظر''، کے جواب میں جو مضمون تحریر کیا گیا تھا اس میں ڈرامے کے فن اور تکنیک پر بڑی دقیق بحث تھی

مولانا عبدالمجید سالک ایک طرح سے نیازمندانِ لاہور کے سالارِ کارواں تھے اس زمانے میں ''روزنامہ انقلاب'' کے مدیر تھے۔ ادھر ظفر علی خاں ''زمیندار'' کے ایڈیٹر تھے۔ پطرس، ڈاکٹر تاثیر اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے سالک کا ساتھ دیا اور ان دنوں میں دونوں طرف سے خوب حریفانہ طبع آزمائی ہوئی۔ ڈاکٹر تاثیر جولانی طبع میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس لیے انہوں نے اس معرکہ آرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس دوران ڈاکٹر تاثیر اور

چراغ حسن حسرت کے درمیان ایک معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے طنزیہ نظمیں لکھی گئیں۔ یہ نیم ادبی معرکے کوئی بڑا ادب تو تخلیق نہ کر سکے مگر اس سے فریقین کی جدتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے خصوصاً ڈاکٹر تاثیر، حسرت، سالک اور مولانا ظفر علی خان کا بہت شہرہ ہوا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین اور ڈاکٹر تاثیر

ڈاکٹر تاثیر اپنی زندگی کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے گو کیمبرج میں تعلیم کے دوران ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی تھی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جسوتی گھوش، سین گپتا اور سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر ڈاکٹر تاثیر نے انجمن کا منشور تیار کیا۔ لندن میں اشتراکی نظریات رکھنے والے طلباء سے ڈاکٹر تاثیر کا بہت میل جول تھا۔ انگریز بطور حکمران کے ایسے ادب کا خواہاں تھا جس میں پڑھنے والوں کو نئی زندگی کے خواب نہ دکھائے جائیں بلکہ پرانی ادبی روایات کو برقرار رکھا جائے جس کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد نے کی تھی۔ یہ امر مسلمان قوم کو خصوصاً اور ہندوستانیوں کو عموماً اس بات کا سبق دیتا تھا کہ موجودہ صورت حال میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ ادب میں پیدا ہونے والے رجحانات سے چوکنا ہو کر ترقی پسند ادب پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے بعد اشتراکی نظریات مختلف ممالک میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے اور ایسے ملکوں میں ان نظریات کے جڑ پکڑنے کی بہت گنجائش تھی جہاں نو آبادیاتی نظام تھا۔ انجمن ترقی پسند کے منشور میں انسانی استحصال، تعصب، خاندان پرستی اور رجعت پسندانہ اندازِ فکر کی مخالفت کی گئی تھی اور اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ادیب، بھوک، جہالت، فرقہ پرستی اور نسلی تعصب کو اس انداز سے اپنا موضوع بنائیں کہ ان برائیوں کو پیدا کرنے والے اسباب کی نشان دہی کی جا سکے۔ یہ تمام باتیں اشتراکی نظریات کے بہت

قریب تھیں جن کا مقصد انسانوں کے درمیان مساوات پیدا کرنا اور وسائل کی منصفانہ تقسیم تھی۔ بعد کے واقعات و حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں دلچسپی علمی نوعیت کی تھی وہ اشتراکی نظریات کے قائل نہ تھے مگر جب وہ کیمبرج سے واپس آئے تو انہیں اسلامیہ کالج لاہور میں بطور پروفیسر کے ملازمت نہ دی گئی بلکہ میاں امیرالدین نے یہ کہا کہ کالج کی کمیٹی ڈاکٹر تاثیر کو ملازم رکھنا چاہتی تھی مگر میں نے ان کے اشتراکی نظریات کی وجہ سے ایسا نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر تاثیر کو اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت نہ مل سکی، جس کے وہ بہت خواہشمند تھے چنانچہ انہوں نے ایم۔اے او کالج، امرتسر کی پرنسپل شپ قبول کر لی۔ وہاں ترقی پسندانہ خیالات کے فروغ کے لیے حالات بہت سازگار تھے۔ صاحبزادہ محمود الظفر ان دنوں وہاں کالج کے وائس پرنسپل تھے اور فیض احمد فیض انگریزی پڑھاتے تھے۔ صاحبزادہ محمود الظفر کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں، جو خود معروف ادیبہ تھیں ترقی پسند نظریات سے بہت متاثر تھیں لندن میں تیار کردہ منشور کا مسودہ ان لوگوں نے بھی دیکھا اور اسے پسند کیا۔ بقول حمید نسیم انگریزی زبان کے مشہور ناول نگار راج آنند ان دنوں امرتسر آئے ان کے ہمراہ سجاد ظہیر تھے۔ بائیں بازو والوں کی کوششوں سے نہ صرف امرتسر میں بلکہ ہندوستان میں دیگر شہروں تک انجمن کی شاخوں کو پھیلا دیا گیا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر تاثیر کی قائداعظم سے ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور وہ قیام پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ناگزیر تصور کرنے لگے۔

ہندوستان نے جب کشمیر پر قبضہ کیا، تو ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کے ادیبوں نے اس کی حمایت کی اور جب ان کا بیان شائع ہوا تو پاکستان میں یہ سوچ ابھری کہ پاکستانی ادیبوں کو بھی اپنا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ پطرس بخاری، فیض، ڈاکٹر تاثیر

اور چند دیگر ادیبوں کے مشورے سے ایک قرارداد کا متن تیار کیا گیا جس میں دنیا بھر کے ادیبوں سے اپیل کی گئی کہ کشمیری حکام اور ہندوستانی فوج کے مظالم کے خلاف پاکستانی ادیبوں کا ساتھ دیں۔ ترقی پسند حلقوں کی جانب سے اسے ڈاکٹر تاثیر کی سازش قرار دیا گیا اور عبداللہ ملک کے مطابق چونکہ ڈاکٹر تاثیر حکومت سے مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے حکومت کے ایما پر یہ قرارداد تیار کی۔ حقائق اس کے برعکس ہیں یہ سلسلہ محمد حسن عسکری اور غلام عباس نے شروع کیا تھا اور ابتدا میں قرارداد کا متن ڈاکٹر تاثیر سے تیار کروایا گیا تھا۔ یہ متن پطرس بخاری کو پسند نہ آیا اور اسے فیض صاحب کے پاس بھیجا گیا آخر کار پطرس بخاری نے خود اس قرارداد کا متن تیار کیا۔ اس لحاظ سے اسے ڈاکٹر تاثیر کی سازش قرار دینا کسی طرح درست نہیں کیونکہ اس میں فیض احمد فیض اور پطرس بخاری بھی شامل تھے اور فیض کے بارے میں تو ہرگز یہ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ اس قسم کی کسی سازش میں شریک ہوئے ہوں گے کیونکہ ان کے تو اپنے اشتراکی نظریات تھے اور وہ خود ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بہت فعال رکن تھے۔

ڈاکٹر تاثیر دو قومی نظریے کے حامی تھے اور ان کے خیالات میں مکمل تبدیلی قائداعظمؒ سے ملاقاتوں کے بعد آئی۔ ان ملاقاتوں نے ڈاکٹر تاثیر کی سوچ کو بالکل واضح کر دیا تھا۔ وہ ایک سچے محب وطن اور قائداعظم کے نظریات کے دل سے قائل تھے۔ دو قومی نظریے کے حامی پاکستان کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر تاثیر اور ڈاکٹر آفتاب احمد

(ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ان کے قریبی ساتھی اور ممتاز دانش ور ڈاکٹر آفتاب احمد کا ایک جامع مضمون)

یہ ۱۹۴۰ء کی دہائی کے شروع کی بات ہے کہ جب میں ایف اے کا طالب علم تھا۔ نئے ادب کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ تاثیر صاحب کی ادبی سرگرمیوں کی رو اگرچہ دھیمی پڑ چکی تھی مگر ان کے نام کی گونج لاہور کی ادبی فضا میں اب بھی اکثر سنائی دے جاتی تھی۔ نوجوان اب بھی تاثیر صاحب کو نئی شاعری اور نئی تنقید کے اہم پیش رو اور ادب کے ایک مقتدر استاد کی حیثیت سے جانتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ادب کے متعلق میرا ذوق وشوق اب اس منزل پر تھا کہ مجھے کتابوں اور رسالوں کی دنیا سے گزر کر ادیبوں کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے کی خواہش ہونے لگی تھی۔ تاثیر صاحب سے میں ملا تو نہیں تھا چونکہ وہ اس زمانے میں ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل تھے اور لاہور آتے بھی تھے تو بہت مختصر وقت کے لیے مگر ان کے متعلق لوگوں کی باتیں سن سن کے دل ہی دل میں ان سے مرعوب ہو چکا تھا۔

دُور دُور سے میں نے تاثیر صاحب کو کئی بار دیکھا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے یوم اقبال کے جلسے میں جو ''لاء کالج'' کے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ پھر حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج کے ایک مشاعرے

میں کہ جہاں وہ صدر تھے۔ فیض کو بھی میں نے اسی مشاعرے میں پہلی بار دیکھا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر نے اس مشاعرے میں اپنی وہ غزل سنائی تھی جو اس زمانے میں خاصی مقبول تھی۔ دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دُنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

تاثیر صاحب نے اپنی مشہور نظم ''رس بھرے ہونٹ'' سنائی اور خوب داد پائی۔ اس کے بعد میں نے انہیں گورنمنٹ کالج کے ایک مشاعرے میں نسبتاً قریب سے دیکھا۔ جہاں وہ کرسیوں کی اگلی صف میں شمعِ محفل بنے بیٹھے تھے، ڈھیلی ڈھالی سفید سِلک کی شیروانی پہنے کرسی پر بار بار پہلو بدلتے ہوئے شعروں پر اپنے دست و بازو کی مخصوص جنبشوں کے ساتھ داد دیتے ہوئے۔ اونچا ماتھا بھاری بھرکم سر، چہرے پر شگفتگی کی چمک، تاثیر صاحب سب کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ شاعر شعر پڑھتا تھا، تو ان کو مخاطب کر کے، سامعین داد دیتے تھے تو ان کی طرف دیکھ کے، خود تاثیر صاحب کو اس مجلس میں اپنی اہمیت کا پورا احساس تھا، اس مشاعرے میں بھی انہوں نے اپنی مشہور نظم ''رس بھرے ہونٹ'' اپنے مخصوص لہجے میں سنائی۔

یہ تاثیر صاحب کی ایک تصویر تھی۔ اس کے بعد ان کی ایک اور تصویر اس سے بالکل مختلف رنگ کی، ایک اور جگہ دیکھنے میں آئی۔ ۱۹۴۰ء کے اپریل یا مئی کا ذکر ہے۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے کہ جس کے زعما میں مظہر علی خان (سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز)،

راج بنس کرشن، رومیش چندر وغیرہ شامل تھے۔ مارکسزم پر لیکچروں کے لیے لاجپت رائے ہال میں ایک سٹڈی سرکل کا اہتمام کیا۔ میرے دوست صفدر میر (زینو) اور میں بھی اس سرکل کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ خشک موضوعات پر ان سے بھی زیادہ خشک لیکچر سنتے سنتے کافی دن ہو چکے تھے۔ آخر ایک شام جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر ''سرمایہ داری کے ارتقاء'' پر لیکچر دیں گے۔ وقت مقررہ پر تاثیر صاحب عجب بے پروائی کے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہاتھ میں ایک سرخ سی کتاب، منہ میں پائپ، ایک ہلکے سیاہی مائل کپڑے کا سوٹ پہنے ہوئے جس پر استری کا کوئی نشان اب باقی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے موضوع کے متعلق انگریزی میں تقریر شروع کی۔ بات انہوں نے کچھ اس بے تکلفی سے چھیڑی کہ فوراً ہی کمرے کی کھنچی ہوئی فضا میں آسودگی سی آ گئی اور چند منٹوں کے بعد تاثیر صاحب مکمل طور پر حاضرین کے ذہنوں پو چھا چکے تھے۔ ان کے اسلوب بیان کی تازگی اور شگفتگی، بات سے بات نکالنے کے نرالے ڈھنگ، کتابی مثالوں کی بجائے آمنے سامنے کے واقعات پر مبنی مثالیں، تیز اور چست فقرے، مارکس کی ''داس کیپیٹل'' سے بڑے بڑے دقیق اور خشک اقتباسات چھانٹ چھانٹ کر سناتے تھے اور ان کی تشریح میں مزاح اور ظرافت پیدا کیے جاتے تھے۔ تاثیر صاحب کی تقریر نے محفل کا رنگ بدل ڈالا، کمرے میں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے ہجوم سے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ یہ محض ان کی طرز کلام کا جادو تھا ورنہ مادیت بالضد اور معاشی تاریخ جیسی سنگلاخ زمینوں کو یوں پانی کر دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

تاثیر صاحب کا یہ رنگ دیکھ کر میرے لیے ان کی شخصیت کی کشش دو چند ہو گئی مگر کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ تاثیر صاحب سری پرتاب کالج کے پرنسپل ہو کر سری نگر چلے گئے

ہیں۔ آخر ۱۹۴۰ء کے کرسمس میں ان سے ملنے کی صورت پیدا ہوئی۔ وہ لاہور میں اپنے بارودخانے والے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے دوست امجد حسین، جو ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہو گئے تھے۔ انہیں حلقے کے جلسے کی صدارت کی دعوت دینے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ امجد ان سے ایک دفعہ پہلے مل چکے تھے۔ میں ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ نام کے تعارف کے بعد کالج، کلاس مضامین، سب کچھ دریافت کیا اور پھر خود ہی کہنے لگے:

''خاص دلچسپی تو آپ کی لکھنا پڑھنا ہی ہوگی۔ ورنہ مجھ سے ملنے کیوں آتے؟''

یہ تھی تاثیر صاحب سے ملاقات کی ابتداء ان کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور بے تکلفی تھی کہ تعارف کے فوراً بعد مجھے دُوری کے وہ پردے جو میرے ذہن نے اپنے اور تاثیر صاحب کے درمیان کھینچ رکھے تھے بتدریج اُٹھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ مجھے چونکہ ادب ہی سے زیادہ دلچسپی تھی اس لیے گفتگو ادب تک ہی محدود رہی۔ میں کسی مسئلے کے بارے میں ان کی رائے پوچھ لیتا اور وہ شروع ہو جاتے۔ میں اگر کچھ کہنے کی جرأت کرتا تو وہ اس توجہ سے سنتے کہ میں کچھ جھینپ کر رہ جاتا۔ کہیں کہیں میری تائید کر کے مجھے بڑھاوا بھی دیے جاتے۔

اس ملاقات کی ایک بات مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ غالب کا ذکر آیا تو کہنے لگے:

> ''ہمارے نوجوان پرانے شاعروں میں صرف غالب کو پڑھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میر، غالب سے بڑا شاعر ہے۔ غالب کا دیوان اس کے کلام کا انتخاب ہے۔ میر کا کلام چھ دیوانوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کے ہاں معمولی اور پست اشعار کی بھرمار بھی خاصی ہے، لیکن اگر ڈھنگ سے میر کا انتخاب کیا جائے تو اس کے ہاں اعلیٰ

اور بلند پایہ اشعار غالب کے مقابلے میں کہیں زیادہ نکل آئیں گے۔
میر کے تجربات کی دنیا وسیع بھی ہے اور متنوع بھی۔''
اس کے بعد انہوں نے میر کی اس غزل کے چند اشعار سنائے جس کا مطلع ہے:

یارو مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ تاثیر صاحب کا مزاج میر کی شاعری کے مزاج سے بہت مختلف تھا۔ میر و غالب کے ذکر کے بعد انہوں نے اپنے پسندیدہ فارسی شاعر نظیری کی ایک غزل کے کچھ اشعار سنائے اور اس شعر میں الفاظ کی صوتی ترتیب کی خاص طور پر تعریف کی:

جمالِ موصولیاں خونے کوفیاں داری
نــــہ در دیــــارِ وفــــا زادۂ دریــــغ از تــــو

اس ملاقات کے چند دن بعد تاثیر صاحب حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسے کی صدارت کرنے آئے۔ کرسمس کی چھٹیوں کا زمانہ تھا، تاثیر صاحب تھری پیس سُوٹ پہنے ہوئے تھے ان کے چہرے پر کشمیر کے موسم سرما کی بخشی ہوئی صحت اور توانائی کی سرخی تھی۔ حلقے کا جلسہ بھی خوب بارونق تھا۔ میراجی نے تاثیر صاحب کی نظروں میں حلقے کی توقیر بڑھانے کی غرض سے خاص طور پر یوسف ظفر کی نظم پروگرام میں رکھوائی تھی کہ وہ اس زمانے میں حلقے کے جدید شعراء میں سر برآوردہ بھی تھے اور میراجی کے قریبی دوست بھی۔ لیکن نظم ان کی اس شام اس قدر کمزور رہی کہ میراجی کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ نظم کا بنیادی خیال ہی بہت عام قسم کا تھا کہ شہر کی زندگی سے شاعر کو مرغزاروں اور دریا کے کنارے حسین منظروں میں

سکون ملتا تھا۔ چنانچہ تاثیر صاحب نے اس پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ اب ہمارے شاعر اس قسم کی فرار پسندی اور رومانیت چھوڑ چکے ہیں اور یہ کہ اب وہ زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔

اُس پہلی ملاقات کے بعد جس کا ذکر اوپر ہوا ہے تاثیر صاحب سے ان کی زندگی کے آخر تک مسلسل میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اپریل ۱۹۴۷ء تک وہ ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہے، مگر لاہور آتے جاتے رہے۔ میں اکثر ان سے ملتا رہا۔ جب بھی مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا ہر دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دہلی میں ان سے ایک ملاقات اس دن بھی ہوئی تھی جس دن مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا پروگرام بنایا تھا۔ میرے دوست امجد حسین اور میں نئی دہلی میں تاثیر صاحب کے ہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک تاثیر صاحب ہندو مسلم کش مکش اور ملکی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ تاثیر صاحب نے اُٹھ کر فون سنا تو ایک دَم سے ان کے منہ سے حیرت واستعجاب کے لہجے میں یہ الفاظ نکلے:

One Thousand Killed!?

امجد اور میں سناٹے میں آ گئے مگر دم بخود بیٹھے فون کی گفتگو کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ چند منٹ کے بعد جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو تاثیر صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ مجید ملک کا فون تھا۔ کلکتے میں ڈائریکٹ ایکشن کے سلسلے میں فساد ہوا ہے اور فوج کی اطلاع کے مطابق اندیشہ ہے کہ ایک ہزار آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔ اس وقت کوئی چار بجے ہوں گے۔ ہم لوگ یہ خبر سننے کے بعد کچھ دیر اور بیٹھے اور پھر تاثیر صاحب نے ہمیں یہ کہہ کے رخصت کر دیا کہ تم پرانی دہلی میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ اب اپنے ٹھکانے پر پہنچو کہیں یہاں بھی فساد نہ ہو جائے۔ ہم جب کناٹ سرکس میں کافی ہاؤس سے ہوتے ہوئے فتح پوری کے علاقے میں

پہنچے تو گلی کوچوں میں کچھ خوف اور سراسیمگی کا منظر تھا اور کلکتے کے فساد کے بارے میں ضمیمے بک رہے تھے اور لوگ ٹولیوں میں کھڑے ان کو پڑھ رہے تھے۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں تاثیر صاحب کے ساتھ کھیلے ہوئے بچپن کے دوست ڈاکٹر نذیر احمد اور ایک پرانے شاگرد عبدالبشیر آذری بھی وہیں تھے، میں جب پہنچا تو گاؤٹ نے انہیں لاچار کر رکھا تھا، ایک قدم چلنا تو کجا پاؤں پر کھڑا ہونا بھی دشوار تھا۔ اسی عالم میں بڑے جذبے کے ساتھ انہوں نے ''پاکستان ٹائمز'' میں اپنے مشہور سلسلۂ مضامین ''پاکستان مبارک'' کی ابتدائی اقساط لکھی تھیں۔ یہ ان کی قوت حیات کا ایک ثبوت تھا، جو انہیں ہر وقت بے قرار رکھتی تھی اور جس کی بدولت وہ کسی نہ کسی ہنگامے میں مصروف رہتے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ آنکھیں دکھنے کو آ گئیں۔ پڑھنے لکھنے سے بھی گئے۔ دن بھر سبز چشمہ لگائے پلنگ پر بیٹھے دوست احباب سے دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ اپنے معمول کے انہماک اور دل جمعی کے ساتھ، صحت یاب ہونے کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن عبدالبشیر آذری اور میں ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آئے۔ تاثیر صاحب نے خلافِ معمول ہم دونوں کا ان سے تعارف نہیں کرایا بلکہ یہ معذرت کرتے ہوئے کمرے سے باہر بھجوا دیا کہ انہیں ان صاحب سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ صاحب بات کر کے چلے گئے تو تاثیر صاحب نے ہمیں واپس بلا لیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہمیں کچھ بتانے کے لیے بے قرار ہیں۔ آخر ہم سے پوچھا کہ یہ صاحب جو آئے تھے تو آپ لوگوں نے ان کو غور سے دیکھ لیا تھا نا؟ ہم نے کہا کہ ان میں کیا خاص بات تھی؟ کہنے لگے کہ خاص بات تو تب معلوم ہو گی جب کچھ عرصے کے بعد ان کی تصویریں اخباروں میں چھپنے لگیں گی۔ چنانچہ اکتوبر میں جب کشمیر کی جنگ شروع ہوئی تو اخباروں میں حکومت آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم کی تصویریں چھپیں۔ یہ وہی صاحب تھے جنہیں ہم نے

تاثیر صاحب کے ہاں سری نگر میں دیکھا تھا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں کشمیر کا معاملہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا تو تاثیر صاحب سردار ابراہیم کے مشیر بن کر ان کے ساتھ نیویارک چلے گئے۔ کشمیر کی سیاست سے تاثیر صاحب کو خاص تعلق رہا تھا۔ شیخ عبداللہ سے اُن کے ذاتی مراسم بھی تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء سے تاثیر صاحب اپنے میسن روڈ والے مکان میں رہنے لگے تھے۔ پھر تو ان کے ہاں آنا جانا میرا معمول بن گیا۔ وہ میرے بزرگ تھے اور مجھ سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ تین برس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس تین برس کے عرصے میں مجھے تاثیر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ مجھے بعض ایسے ہنگاموں کے پس منظر کا بھی ذاتی طور پر علم ہے جو اس دوران میں ان کی ذات سے منسوب ہوئے۔

ترقی پسند حلقوں کے خلاف تاثیر صاحب کی صف آرائی کا پس منظر ایک ایسا واقعہ ہے جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، چونکہ اس ضمن میں بہت سی غلط باتیں مشہور ہیں۔ تاثیر صاحب نے جس انداز سے یہ جنگ لڑی اور اس میں جو کچھ روا رکھا اس کے متعلق ان کے دوستوں اور مداحوں میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مگر ایک بنیادی بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ترقی پسند ادیبوں کے متعلق ان کا رویہ پاکستان کے قیام کے بعد بدلا، یہاں یہ یاد دلاتا جاؤں کہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد ڈالنے والوں میں سجاد ظہیر کے ساتھ تاثیر صاحب بھی شامل تھے۔ بہرحال پاکستان سے پہلے ان کے خیالات کچھ ہی رہے ہوں، مگر جب میں ان سے اگست ۱۹۴۶ء میں دلی میں ملا تو وہ پورے طور پر پاکستانی نقطۂ نظر اپنا چکے تھے۔ اس ملاقات میں انہوں نے بالکل اسی انداز کی باتیں کیں۔ ان کے اپنے قول کے مطابق یہ تبدیلی ان میں حکومت ہند سے متعلق رہنے کے بعد آئی جہاں انہیں حالات و واقعات کو قریب سے دیکھنے

کا موقع ملا تھا۔ جون ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا۔ اور اس کے فوراً بعد انہوں نے ''پاکستان مبارک'' کا سلسلۂ مضامین لکھا۔ یہ مضامین اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ تاثیر صاحب پہلے پاکستانی تھے جنہوں نے پاکستان کے قیام سے بھی بیشتر اس ملک کے سیاسی، اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی مسائل پر سنجیدگی اور دردمندی سے غور کیا اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کے بارے میں ایک مفصل اور متوازن خاکہ پیش کیا۔ ان مضامین سے تاثیر صاحب کے مطالعہ اور فکر و نظر کی وسعت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف ہی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے پاکستان کو کس جوش، کس جذبے اور کس اُمنگ کے ساتھ قبول کیا تھا۔

ترقی پسند پاکستان کے بارے میں اس سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تاثیر صاحب یہ سمجھنے میں مسلمانوں کے باشعور طبقہ کے ہم خیال تھے کہ پاکستان مسلمان قوم کے خوابوں کی تعبیر ہے مگر ترقی پسند اسے ایک اور رنگ میں دیکھتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی پہلی بنیاد تو یوں پڑی اور دوسری اس وقت جب کشمیر میں جنگ چھڑی، ترقی پسند حلقوں نے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے داخلہ کی حمایت کی بلکہ اسے عوام دوست عناصر کا فرض قرار دیا۔ سجاد ظہیر ہندوستان میں کچھ اسی قسم کا بیان دے کر پاکستان آئے تو دیرینہ مراسم کی بنا پر تاثیر صاحب سے بھی ملے۔ تاثیر صاحب نے اس ملاقات کا حال بعد میں مجھے خود سنایا۔ انہوں نے کشمیر کے متعلق پارٹی لائن کے بارے میں سجاد ظہیر سے تفصیلی بات کی۔ سجاد ظہیر، تاثیر صاحب کی گفتگو کے نوٹ لیتے گئے اور یہ کہہ گئے کہ وہ اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنے کے لیے پارٹی کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ غرض ترقی پسند حلقوں کی ان کارروائیوں کے باعث تاثیر صاحب ان سے بددل ہو گئے تھے مگر ابھی تک انہوں نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی اس کی ابتداء ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔ جس کی تفصیل

جہاں تک مجھے یاد ہے بیان کیے دیتا ہوں۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس وائی۔ سی۔ اے ہال لاہور میں منعقد ہوئی۔ سجاد ظہیر اس میں شریک تھے۔ تاثیر صاحب کو بھی شرکت کی دعوت تھی بلکہ انہیں مشاعرہ کی صدارت کرنی تھی۔ مشاعرہ رات کو تھا اور شام کے اجلاس کی نشست جاری تھی۔ ایک صاحب نے ایک ریزولیوشن ذریعۂ تعلیم کے متعلق پیش کیا۔ مجھے ٹھیک الفاظ تو یاد نہیں مگر مفہوم کچھ اس طرح کا تھا جس سے اُردو زبان کی قومی حیثیت پر زد پڑتی تھی۔ جب یہ ریزولیوشن پیش ہوا تو میں نے دیکھا کہ تاثیر صاحب کچھ سنجیدہ سے ہو گئے ہیں، انہوں نے دو تین دفعہ انگریزی میں ''یہ خطرناک چیز ہے'' کہا۔ تقریر ختم ہونے پر وہ سٹیج پر پہنچے اور ذرا جوش کے ساتھ ایک مختصر سی تقریر کی اور پھر ایک ترمیم پیش کی، جس کا مقصد ریزولیوشن کے قابلِ اعتراض عنصر کو خارج کرنا تھا۔ جلسہ کے صدر حفیظ جالندھری تھے۔ انہوں نے بھی تاثیر صاحب کی ترمیم کی حمایت کی اور وہ کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ سٹیج پر بیٹھے ہوئے سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کو یہ کارروائی پسند نہ آئی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ جلسہ برخاست ہوا، ایک گھنٹے کے وقفہ کے بعد مشاعرے کی محفل جمنے والی تھی، اس میں تاثیر صاحب کو شامل ہونا تھا، لہٰذا وقت گزارنے کے لیے وہ اور میں کافی ہاؤس چلے گئے، کچھ دیر کے بعد ہم نے پھر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کا رخ کیا۔ تاثیر صاحب مشاعرہ میں مجھے ساتھ رکھنے پر مُصر تھے۔ مجھے کہیں اور جانا تھا اس لیے میں نے اجازت چاہی اور تاثیر صاحب اپنے اسلامیہ کالج کے زمانے کے پرانے رفیق ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے ہمراہ مشاعرہ میں شرکت کے لیے اوپر ہال میں چلے گئے۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے، میں ابھی نیچے سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ تاثیر صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے پھر نمودار ہوئے اور آتے ہی بولے ''لو بھئی میں بھی مشاعرہ میں شامل نہیں ہو رہا۔ چلو آؤ گھر

چلیں" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیوں؟" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، غصہ ان کے چہرے سے نمایاں تھا۔ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے جو اُن کے ہمراہ واپس آئے تھے مجھے بتایا کہ مشاعرہ والوں نے بڑی نامعقول حرکت کی ہے۔ تاثیر صاحب جب گیٹ پر پہنچے تو وہاں ایک نوجوان کا مریڈ نے تاثیر صاحب کو روک لیا اور ان سے ٹکٹ طلب کیا، تاثیر صاحب نے کہا۔ "مجھ سے کیسا ٹکٹ؟" اس نے اصرار کیا۔ اس پر تاثیر صاحب ذرا برہم ہوئے پھر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا، ٹکٹ مانگنے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر کھینچ لیا اور ایک دم مڑ کر واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد پاکستان کے ادیبوں کی طرف سے کشمیر کے بارے میں ایک مشترکہ اعلان شائع کیا گیا جس پر سوائے فیض صاحب کے سب ترقی پسند ادیبوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بیان کی اشاعت کے پس منظر میں بھی ایک داستان ہے، میں چونکہ اس سے بھی قریبی طور پر متعلق تھا۔ اس لیے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے اسے بھی دہراتا ہوں۔

ترقی پسند حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور ہوا کہ یہ بیان تاثیر صاحب کی "سازش" کا نتیجہ تھا۔ چونکہ تاثیر صاحب کو معلوم تھا کہ ترقی پسند اس قسم کے بیان کی تائید نہیں کریں گے اس لیے ان کے خلاف یہ گہری چال چل کر عوام کو ان کے خلاف کرنے کے جذبات ابھارنے اور حکومت کی نظر میں انہیں زیادہ سے زیادہ مشتبہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب اصل حقیقت سن لیجئے۔ ہندوستان کے کچھ ادیبوں نے جن میں دو ایک مسلمانوں کے نام بھی شامل تھے، کشمیر کے بارے میں ہندوستانی نقطۂ نظر کی حمایت میں ایک بیان شائع کیا۔ محمد حسن عسکری، غلام عباس اور میں ایک جگہ جمع تھے۔ وہاں یہ ذکر آیا تو ہم نے سوچا کہ پاکستان کے ادیبوں کو اس معاملہ میں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ تجویز یہ ہوئی کہ ایک

بیان یہاں سے بھی شائع کیا جائے جس میں پاکستانی نقطۂ نظر کی حمایت ہو، تا کہ باہر کی دنیا کو حقیقت حال معلوم ہو سکے۔ غلام عباس اور میں تاثیر صاحب کے ہاں پہنچے اور اس تجویز کا ذکر کرنے کے بعد ان سے بیان کی عبارت لکھنے کی درخواست کی۔ تاثیر صاحب نے ارتجالاً ایک مختصر سا بیان لکھ کر ہمارے حوالہ کیا اور ہم نے ادیبوں سے دستخط لینے کی مہم شروع کر دی۔ اسی سلسلے میں بخاری صاحب کے پاس گئے جو ان دنوں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ انہیں تاثیر صاحب کی لکھی ہوئی عبارت پسند نہ آئی اور ناکافی معلوم ہوئی۔ ان کی رائے تھی کہ اس بیان میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہیے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بیان فیض صاحب سے لکھوایا جائے اور انگریزی میں ہو تو اچھا ہے تا کہ باہر کے ملکوں میں کام آ سکے۔ چنانچہ فیض صاحب سے وقت مقرر کیا گیا، دوسرے دن ہم ان کے ہاں پہنچے، فیض صاحب بولتے گئے اور میں لکھتا گیا، ٹائپ کرا کے ہم نے وہ بیان بخاری صاحب کو دکھایا تو انہوں نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ اس کے بعد بخاری صاحب نے رات کا بیشتر حصہ اس بیان پر صرف کیا اسے کاٹ چھانٹ کے، اپنی پسند کے مطابق بنایا، خود اسے ٹائپ کیا اور اس طرح یہ بیان مکمل ہوا۔ اب سوال تھا اردو بیان کا، بخاری صاحب کو اصرار تھا کہ وہ بھی ہماری طرف ہی سے جانا چاہیے، عبارت ادیبوں کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔ انگریزی بیان کا ترجمہ اگر اخباروں کے مترجموں پر چھوڑا گیا تو وہ اسے خراب کر دیں گے، چنانچہ اُردو ترجمہ کا کام صوفی تبسم صاحب کے سپرد ہوا، شام کو جب ہم ترجمہ لے کر بخاری صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے وہ بھی پسند نہ کیا۔ آخر صوفی صاحب کی درخواست پر انہوں نے اُردو ترجمے کو درست کرنا شروع کر دیا۔ رات گئے تک یہ کام مکمل ہوا، اور دوسرے دن انگریزی اور اُردو دونوں بیانات اخبارات میں دے دیے گئے۔ یہ ہے اس بیان کی اشاعت کی داستان اگر یہ ''سازش'' تھی تو اس میں

بخاری صاحب بھی شریک تھے اور فیض صاحب بھی۔

تاثیر صاحب نے ترقی پسند حلقوں سے چھیڑ چھاڑ ۱۹۴۸ء کی گرمیوں میں اپنے ان مضامین میں شروع کی جو انہوں نے ڈاکٹر حجازی کے نام سے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں لکھے تھے۔ باقاعدہ محاذ انہوں نے تقریباً ایک سال بعد ''آفاق'' اور ''چٹان'' کے صفحات میں کھولا اور نظمیں ''مغربی پاکستان'' میں لکھیں۔ تاثیر صاحب کا سب سے بڑا ہدف میاں افتخار الدین تھے۔ لہٰذا ان کے اخبار ''امروز'' میں مولانا چراغ حسن حسرت نے تاثیر صاحب پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ ۱۹۴۹ء کی گرمیوں میں تاثیر صاحب خود تو مری اور نتھیا گلی میں تھے۔ مگر ان کے ذکر سے لاہور کی محفلیں آباد تھیں۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی تحریروں کے زور سے لاہور میں دشمنوں کے طعن و تشنیع اور دوستوں کے گلوں شکووں کا سامان فراہم کیے جاتے تھے۔ تاثیر صاحب کو صحافتی لڑائیاں لڑنے کا شوق تھا، ان میں ایک ایک خاص قسم کی شوریدہ سری تھی جو اسی طرح تسکین پاتی تھی، بقول شخصے ان کو لڑکپن میں بھڑ کی دُم میں دھاگہ باندھنے کی عادت رہی ہوگی۔ ترقی پسند حلقوں کے خلاف جنگ میں تو ان کے پاس ایک وجہ جواز بھی موجود تھی بہر حال اس کا انجام بہت افسوس ناک ہوا۔ آخر کو تاثیر صاحب اور ان کے پرانے دوست مولانا چراغ حسن حسرت میں ٹھن گئی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بے اَماں تیر ونشتر کی زد میں آ گئے۔

مگر یہ صحافتی جھگڑے تاثیر صاحب کی زندگی نہیں تھے، انہیں زیادہ تر اُن کی شوریدہ سری کا اظہار ہی سمجھنا چاہیے۔ ذاتی تعلقات کے معاملہ میں ان کی صفت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آخر آخر میں ان کے بعض دوستوں اور ان کے درمیان کشیدگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی مگر میں ان کی صحبت میں بیٹھنے والے کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کبھی کسی دوست کی برائی نہیں کی۔ دوستوں سے گلے شکوے کے موقعے ان کی زندگی میں

کئی بار آئے۔ شکایت زمانہ بھی ان کو یقیناً ہی ہوگی مگر اس معاملے میں وہ بہت گہرے آدمی تھے۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کم سے کم مجھے ان کی کوئی ایسی بات یاد نہیں۔ کبھی کوئی اس قسم کا ذکر بھی ہوتا تو طرح دے جاتے۔ دشمنوں کے معاملے میں بھی ان کا روّیہ کچھ اسی قسم کا تھا۔ قلم کی جنگ لڑنا ان کا محبوب مشغلہ ضرور تھا۔ مگر عموماً حریف بذلہ وحریف سخن ہونے کی حد تک، حریف دشنام نہیں اور یہ لڑائیاں کچھ ایسی دیر پا بھی نہیں ہوتی تھیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تاثیر صاحب کو دشمنی مول لینا تو آتا مگر دشمنی پالنا اور تلخی برقرار رکھنا ان کی عادت نہیں تھی اور نہ انہیں اس کی فرصت تھی۔ وہ طبعاً ایسے ہشاش بشاش اور زندہ دل آدمی تھے، جو خوش رہنا اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی ہنگامے میں مشغول رکھنا جانتا ہو۔

جھگڑے فساد اور چھیڑ چھاڑ والی تحریریں تاثیر صاحب ہمیشہ مختلف قسم کے قلمی ناموں سے لکھتے تھے۔ البتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ڈاکٹر حجازی کے نام سے جو سلسلہ مضامین انہوں نے شروع کیا وہ اس نام سے جاری رہا۔ مگر نام سے کیا ہوتا ہے ان کی شوخی تحریر صاف کہے دیتی تھی کہ میں کس کے قلم سے نکلی ہوں۔ چنانچہ تاثیر صاحب نے جب محمد حسن عسکری کے خلاف لکھنا شروع کیا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تاثیر صاحب ہی ہیں۔ پھر ایک مضمون جب انہوں نے عسکری کے چھوٹے بھائی کے نام سے لکھا تو میرا یقین اور پختہ ہو گیا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ قلمی ناموں کے سلسلے میں وہ اس قسم کی حرکت بھی کیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے ان سے پوچھا نہیں، کیونکہ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہ کبھی اقرار نہیں کریں گے۔

تاثیر صاحب اور عسکری ایک دوسرے کو سرسری طور پر دہلی سے جانتے تھے۔ مگر عسکری لاہور میں میرے ہی ہمراہ تاثیر صاحب کے ہاں آنے جانے لگے تھے، پھر کبھی کبھی اکیلے بھی چلے جاتے تھے، کچھ عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کے باہمی تعلقات میں کچھ

فرق آ گیا ہے۔ دونوں کی طبیعتوں میں اتنا اختلاف تھا کہ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔
میں نے اس سلسلے میں کوئی کرید نہیں کی۔ اور نہ ان دونوں میں سے کسی نے مجھے کچھ بتایا۔
شاید اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ میرے دونوں سے الگ الگ تعلقات ہیں۔ تاثیر صاحب
میرے بزرگ تھے اور عسکری میرے دوست۔ اب جو تاثیر صاحب نے عسکری کے خلاف
لکھنا شروع کیا تو مجھے تاثیر صاحب کی اس ناروا حرکت سے بہت کوفت ہوئی۔ بہر حال میرا
خیال ہے کہ تاثیر صاحب کو اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ آ بیل مجھے مار اوالی بات ثابت
ہوگی۔ عسکری نے ایسا سخت جوابی حملہ کیا کہ کچھ کہنے کو باقی نہیں چھوڑا۔ میں بھلا کیوں
تاثیر صاحب سے اس کے متعلق کچھ کہتا مگر جونہی عسکری کی، جھلکیاں، لیے ہوئے
ماہنامہ ''ساقی'' کا شمارہ آیا مجھے یہ خدشہ ضرور ہوا کہ ممکن ہے تاثیر صاحب شکایتاً یا طنزاً مجھ
سے اس کا ذکر کریں کیونکہ انہیں عسکری سے میرے تعلقات کا علم تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو
میرے لیے ایک مشکل اور ناگوار صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔
مدت کے بعد ایک دن بر سبیل تذکرہ سرسری طور پر بس یہ کہا کہ میں نے تو پڑھا نہیں مگر
جاوید اقبال نے مجھے بتایا ہے کہ عسکری نے میرے خلاف کوئی مضمون لکھا ہے اور اتنا کہنے
کے بعد بات ختم کر دی۔ اب اسے آپ ان کی شفقت سمجھ لیجئے کہ انہوں نے عمداً مجھے ذاتی
تعلقات کی کسی آزمائش میں نہیں ڈالا یا ان کی اسی شخصی خصوصیت کا ثبوت کہ جس کی طرف
میں اشارہ کر چکا ہوں یعنی یہ کہ تاثیر صاحب ذاتی تعلقات میں بہت گہرے آدمی تھے۔ ان
کے دل میں کچھ بھی ہو۔ وہ دوستوں اور دشمنوں کے گلے شکوے یا ان کے بارے میں کسی تلخی
اور کدورت کو زبان پر نہیں لاتے تھے۔ بہر حال اس قصے میں تاثیر صاحب کے دوستوں
بخاری صاحب، صوفی صاحب، مجید ملک صاحب اور فیض صاحب، سب کی یہی رائے تھی
کہ تاثیر صاحب کو اس عمر میں ایک نوجوان ادیب کے منہ آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر

معلوم ہوتا ہے کہ تاثیر صاحب کو اس قسم کی ہنگامہ خیزی میں اتنا مزہ آتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ بھول جاتے تھے۔

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ تاثیر صاحب اپنے قلمی ناموں کا اقرار نہیں کیا کرتے تھے مثلاً مجھے معلوم تھا کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا کالم نویس ڈاکٹر حجازی تاثیر صاحب ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ یہ ایک اور شخص کا قلمی نام ہے، البتہ وہ شخص میرے پاس آتا جاتا ہے، مضمون بھی کبھی کبھی دکھا لیتا ہے، میں اصرار کرتا تو وہ بات ہنسی میں اڑا دیتے مگر اقرار نہ کرتے، آخر میں نے ایک دن کہا کہ اس شخص سے ہمیں ملایئے اور انہوں نے ملانے کا وعدہ کرلیا۔ کچھ دنوں کے بعد امجد اور میں ان کے ہاں گئے تو ہم سے کہنے لگے کہ اچھا کل شام چائے یہاں پینا اور حجازی سے بھی مل لینا، دوسرے دن شام کو تاثیر صاحب کے ہاں چائے ہوئی، گپ چلی، حجازی کا ذکر آیا تو اپنے مخصوص شرارت آمیز انداز میں ہمیں اطلاع دی کہ بھئی وہ تو آج صبح کی گاڑی سے کہیں چلا گیا ہے ____ خیر اس پر ہنسی مذاق ہوتا رہا، اگلی صبح میں نے ''سول'' اخبار اٹھا کر دیکھا تو حجازی نے لکھا تھا:

''یہ میرا آخری مضمون ہے۔ اب یہ سلسلہ بند ہوتا ہے۔ کیونکہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں ____''

اور اُسی دن مجھے معلوم ہوا کہ تاثیر صاحب اسلامیہ کالج کے پرنسپل بننے والے ہیں، حجازی کے رخصتی مضمون کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی!

تاثیر صاحب کی گوناگوں دلچسپیوں کی وجہ سے ان کے ہاں آنے والوں میں ہر قسم ہر خیال اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے، کالجوں کے طلبہ اور پروفیسر، بڑے بڑے افسر اور سیاسی لیڈر، ادبا اور شعراء مصور، صحافی اور شرع و دین کے عالم، غرض کہ زندگی کا وہ کون سا شعبہ تھا جس کے لوگوں سے تاثیر صاحب کو مناسبت نہ تھی۔ ان میں، عقل والے بھی تھے اور

سراپا لال بجھکو بھی، مگر تاثیر صاحب کے دروازے ان سب پر وا تھے، وہ ہر ایک سے یکساں حسن سلوک سے پیش آتے۔ میں نے کبھی انہیں کسی شخص سے یا کسی گفتگو سے بور ہوتے نہیں دیکھا تھا یا کم سے کم ان کی زبانی اس کا اظہار کبھی نہیں سنا تھا۔ ان کی محفل میں گویا دنیا کی سیر ہو جاتی تھی کیونکہ ہر چیز پر گفتگو ہوتی تھی تازہ بتازہ سکینڈلز سے لے کر سنجیدہ سے سنجیدہ، علمی مسائل تک، تاثیر صاحب موقع محل اور شرکائے محفل کا رنگ دیکھ کر جس طرف چاہتے گفتگو کا رُخ موڑ دیتے۔ یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں، ہر قسم کی رام کہانیاں چھیڑی جاتی تھیں اور تاثیر صاحب کم سے کم اس وقت ان میں ایسے محو ہوتے کہ بس انہیں کے ہو رہتے اور داستان در داستان یہ سلسلہ شروع رہتا۔ تاثیر صاحب کا روّیہ اس قدر بے تکلفانہ ہوتا تھا کہ وہ کسی چھوٹے بڑے کو غیرت اور اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیتے تھے۔ تاثیر صاحب کی محفل کی امتیازی شان ان کی اپنی گفتگو تھی۔ وہ باغ و بہار باتیں کرتے تھے۔ ہر قسم اور ہر رنگ کی باتیں کبھی سنجیدہ اور متین کبھی ہلکی پھلکی۔ شرارت آمیز گفتگو ان کی خاص چیز تھی۔ ان کا یہ رنگ عموماً اسی وقت کھلتا جب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی موجود ہوں۔ صوفی صاحب ان کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور ایف سی کالج میں ہم جماعت بھی رہے تھے۔ ان سے چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کرنا تاثیر صاحب کا خاص مشغلہ تھا۔

تاثیر صاحب کی ساری ہاؤ، ہُو کا مرکز ان کے سونے کا کمرہ تھا۔ وہ عموماً اپنے پلنگ پر کبھی نیم دراز اور کبھی بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے، لکھنے پڑھنے کا کام بھی وہ اسی حالت میں کرتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کا کھانا بھی ایک ٹرے میں لگ کے ان کے پاس وہیں آ جاتا تھا۔ ان سے ملنے والے پلنگ کے اردگرد رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاتے تاثیر صاحب ان سے گفتگو بھی کیے جاتے تھے اور اس دوران میں مسز تاثیر کے استفسار پر گھریلو معاملات میں

مشورے بھی دیے جاتے تھے۔ بچوں کے لڑائی جھگڑے بھی چکاتے رہتے تھے، انہیں پیار چمکار سے بہلاتے بھی رہتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ملازموں سے باز پرس بھی کر لیتے تھے۔ مختصر یہ کہ تکلف نام کی کسی چیز کا دخل انکی زندگی میں بہت کم تھا، انہوں نے شادی ایک انگریز خاتون سے ضرور کی تھی مگر وہ ایک کھلی ڈھلی طبیعت کے دیسی آدمی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ لاہور کے محلہ بارود خانہ میں گزرا تھا۔ اندرونِ شہر کے محلوں کا کلچر چھاؤنی یا سول لائنز کے کلچر سے بہت مختلف ہوتا ہے یہاں طبقاتی اونچ نیچ اور مختلف طبقوں کے افراد کے درمیان علیحدگی اور لاتعلقی کم دیکھنے میں آتی ہے

شاید اسی وجہ سے ان کی طبیعت میں ایک ایسی کشادگی آ گئی تھی جو میل ملاپ کی سطح پر ان کے بعد کی مختلف طرزِ زندگی میں بھی ہمیشہ نمایاں رہی، وہ خاندانی ماحول، تعلیم و تربیت کے لحاظ سے خواص میں سے ہوتے ہوئے بھی عوام کے آدمی تھے۔ سردیوں میں تو سوٹ بوٹ پہنتے تھے مگر گرمیوں میں عموماً سفید لٹھے کا کرتا پاجامہ اور کبھی ضرورت کے وقت شیروانی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی یا ملتانی کھسہ۔ اس زمانے کے عام شہریوں کی طرح ''تانگے'' کی سواری کے شوقین تھے۔

تاثیر صاحب سے میں تقریباً دس برس تک ملتا رہا۔ اس دوران میں مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں کبھی غمگین یا پژمردہ دیکھا ہو۔ وہ ہر وقت ہنستے کھیلتے نظر آتے تھے۔ شگفتگی ان کے مزاج کا بنیادی عنصر تھی۔ میں نے انہیں لمبی بیماری کی حالت میں بھی دیکھا ہے، مجال ہے جو اُن کے مزاج میں ذرا بھی چڑ چڑا پن آیا ہو، ناگوار حالات میں بھی وہ اپنے محبوب مشاغل جاری رکھتے تھے۔ عین بیماری کے عالم میں بھی بیماری کی باتیں نہیں کرتے تھے، کبھی اس کا ذکر بھی ہوتا تو وہ اسے مختصر کر دیتے۔ عام آدمی کے لیے بستر کی قید ایک مصیبت بن سکتی تھی مگر تاثیر صاحب کبھی اس کی شکایت نہ کرتے تھے۔

اسی علالت کے دوران ایک شام میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ انکے خاص معالج اور دوست ڈاکٹر بھیک، بلڈ پریشر کا آلہ ہاتھ میں لیے کمرہ میں داخل ہوئے۔ بلڈ پریشر لیا گیا اور وہ بالکل نارمل نکلا۔ ڈاکٹر بھیک نے خوش ہو کر تاثیر صاحب کو بتایا اور اس کے فوراً بعد ان کی بیگم کو خبر دیتے کمرے سے باہر چلے گئے۔ تاثیر صاحب اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور کسی قدر خوشی کے ساتھ کہا: ''چلو اچھا ہوا، بلڈ پریشر نارمل نکلا۔ بھیک نے جب آلہ لگایا تو مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا''۔ میں نے کہا____ ''مگر آپ کے چہرے سے تو کچھ ظاہر نہیں ہوا'' اس پر مسکرا دیے اور پھر کہا:

''مجھے بیماری کی وجہ سے پریشانی یا وحشت نہیں ہوتی، بلکہ کرس (کرسٹبل تاثیر) اور بچوں کا خیال ہے اور پھر میاں، بات تو یہ ہے کہ:

هزار شمع بکشتند و انجمن باقیست''

اور یہی وہ مصرع ہے جو انہوں نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے اپنے ایک رفیق کار کے سامنے بھی پڑھا تھا جب انہوں نے اپنی اس تشویش کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی کی فلاں کمیٹی میں اگر آپ نہ ہوئے تو کام کیسے چلے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ یونیورسٹی ہی نہیں صوبے کے تعلیمی منصوبوں کی ترتیب و تشکیل میں بھی تاثیر صاحب کا بڑا عمل دخل تھا۔ ایس۔ ایم شریف جو اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے سربراہ تھے، تاثیر صاحب کے ہم جماعت اور دوست تھے وہ مستقل ان سے ان معاملات میں مشورہ کرتے رہتے تھے، شریف صاحب نے تاثیر صاحب کے مجموعۂ کلام ''آتش کدہ'' میں شامل تاثیر صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنی ایک تحریر میں اس امر کا اعتراف کیا ہے اور بزم اقبال، آرٹ کونسل وغیرہ کی تاسیس کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو سراہا ہے۔

تاثیر صاحب کی شخصیت گوناگوں پہلوؤں کی حامل تھی، ان کی دلچسپیوں کی دنیا متنوع

بھی تھی اور وسیع بھی۔ وہ انگریزی ادب کے استاد تھے اور اُردو کے ادیب، شاعر اور نقاد۔ ادب وشعر ان کا خاص مضمون تھا۔ مگر انہیں مصوری سے بھی خاص شغف تھا، چغتائی صاحب کی تصویروں کو ملک بھر میں روشناس کرانے اور مصور دیوان غالب کے چغتائی ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ بیسویں صدی کی فکری اور سیاسی تحریکوں، حالاتِ حاضرہ اور ان سے متعلقہ مضامین، صحافت، نشرواشاعت وغیرہ کے معاملات میں ان کا بہت کام تھا۔ قدرت نے ان کو ذہن رسا سے بھی نوازا تھا، وہ محض کتابی آدمی نہیں تھے ان میں بلا کی عملی سوجھ بوجھ بھی تھی اور حالات وواقعات کا اندازہ کرنے کی فہم وفراست بھی مگر ان کا اصلی کام تعلیم وتہذیب اور ادب کی دنیا ہی سے وابستہ تھا۔ وہ ادب کے استاد اور ادیب، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ پینتالیس پچاس برس گزرنے کے بعد بھی ان کی ادبی صلاحیت کا چرچا بہت عام ہے یا یہ کہ ادب کی دنیا میں اُن کا نام اور مقام بہت اونچا ہے، ہاں یہ ضرور یاد دلاؤں گا کہ تاریخی اعتبار سے اُردو ادب میں جمال پرستی کے دور میں تاثیر صاحب نے آنے والے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے ایک نیا راگ الاپا تھا۔ انہوں نے دھن دولت والوں، مزدوروں اور کسانوں کے بارے میں چکی پیسو، روٹی کھاؤ جیسی عوامی نظمیں اس زمانے میں لکھی تھیں کہ جب اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو اس قسم کے عوامی مسائل کی اطلاع تک نہیں تھی۔ بعد کو ۱۹۳۵ء میں لندن میں تاثیر صاحب ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد رکھنے والوں میں بھی سجاد ظہیر کے ساتھ شامل تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاثیر صاحب ترقی پسند ادب کی تحریک کی ابتداء سے بھی پہلے کے ترقی پسند تھے۔

تاثرات

بیگم بلقیس تاثیر

تاثیر کو انسانوں سے اتنی محبت تھی انہیں اپنے ہم جلیسوں کے مفاد اور مسائل سے اتنی دلچسپی تھی اور ان کے دلوں کو ٹٹولنے اور ان کا بھید پالنے کا اتنا ملکہ رکھتے تھے کہ ہمارا گھر ہر وقت طرح طرح کے لوگوں سے بھرا رہتا۔ تاثیر کی ہمدردیاں سب کے لیے اتنی ہمہ گیر تھیں کہ ان کے دوستوں میں مسلم لیگی رضا کار، جماعت اسلامی کے ارکان، کیمونسٹ، احرار، سوشلسٹ اور کانگریسی سبھی شامل تھے۔ ان کے دل اور گھر کے دروازے ان سب کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ان کے دوست تھے ان میں وزیر بھی تھے اور چٹھی رسان بھی، اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی تھے اور کلرک بھی، دکھی بیویاں بھی اور خوش باش جوڑے بھی۔ تاثیر کسی امتیاز کے بغیر ان سب کا انتہائی تپاک سے خیر مقدم کرتے تھے۔

پروفیسر حمید احمد خان

ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت میں دو ایسے کمال جمع ہو گئے تھے جو صرف بڑے آدمیوں کی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کا وہ خلقی جوہر جو محض خوبیٔ تقدیر سے ان کے حصے میں آیا۔ دوسرے اس خلقی جوہر کو اپنی کوشش و کاوش سے فروغ دینے کی وہ غیر معمولی استعداد

جو تقدیرِ خداوندی پر تدبیر کے اضافے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی شخصیت کے یہ فطری اور اکتسابی پہلو محض مفرد عنصر نہ تھے۔ جس طرح ان کا اکتساب ہمیشہ بوقلموں تجربات کی جستجو میں رہا، اسی طرح ان کی طبیعت کا خداداد جوہر بجائے خود دو بظاہر متضاد کیفیتوں سے مرتکب تھا۔ میں نے ''بظاہر'' کا لفظ دانستہ اور احتیاط سے استعمال کیا ہے، اس لیے کہ دراصل ان دو کیفیتوں میں کوئی تضاد نہ تھا۔ فرق، اور واضح فرق، البتہ ان کیفیتوں کے درمیان موجود تھا۔ ان میں سے ایک تو ان کی لامحدود فراست تھی۔ ہر وقت بیدار، ہر وقت خبردار فراست ــــ اور دوسری ان کی لامحدود لذت پسندی و لذت طلبی۔ یہ دو نقطے گویا ان کی عقلی و حسی فطرت کا محور تھے۔ کیفیت کے بنیادی فرق کے باوجود یہ دونوں مضطرب بلکہ طوفانی نقطے بلحاظ شدت ایک سطح پر تھے اور ان کا اشتراکِ عمل حیرت انگیز تھا۔

اس اشتراکِ عمل کی صورت یہ تھی کہ ڈاکٹر تاثیر صاحب اگر ایک طرف اپنی فراست کے استعمال سے ناقابلِ قیاس لذت حاصل کرتے تھے تو دوسری طرف اپنی لذتوں کو اپنی فراست کی مدد سے لذیذ تر بنا لیتے تھے۔

ڈاکٹر تاثیر کی لذت طلبی کا میدان ایک لامحدود میدان تھا مگر بایں ہمہ سپاٹ میدان نہ تھا۔ یہ رنگا رنگ میدان بے شمار تختوں میں منقسم تھا۔ ہر تختہ ایک جداگانہ کیفیت سے سرشار، اور پھر اس تختے کے اوپر ایک اور تختہ اور اس کے بعد ایک اور۔ کام و دہن کی لذتیں، لطفِ سخن کی لذتیں، حکیمانہ نکتہ سنجی کی لذتیں، کلامِ الٰہی کی تفسیر کی لذتیں، ڈاکٹر تاثیر ان سب کے رسیا تھے۔ نکتہ طرازی اور لذت اندوزی ان کے لیے ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ ایک طرف زبان کے چٹخارے کے ساتھ ان کی روح جھوم جاتی تھے، دوسری طرف خالص فنی یا روحانی سرور ان کے بدن کے روئیں روئیں پر وجد طاری کر دیتا۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنی طبیعت کے اس جوہرِ خداداد کو اپنی کوشش سے جس طرح سنبھالا

اور پروان چڑھایا۔ اس کا ذکر ان کی زندگی کے بڑے کارناموں میں ہونا چاہیے۔ مناسب حفاظت اور تربیت کے بغیر یہ جوہر پارہ پارہ ہو کر تلف ہو جاتا۔ ان کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا رخ اس جوہر کی صحت مندانہ نشوونما کے خلاف تھا۔ امرتسر کے قصباتی علاقے میں ایک زمیندار کا بیٹا جو ۱۹۰۴ء کی وبائے طاعون میں پہلے باپ کے سائے سے، پھر ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا، اس کم سن یتیم کو خالہ نے اپنے گھر میں پناہ دی۔ خالہ، میاں نظام الدین مرحوم کی زوجہ تھیں۔ اس لحاظ سے بڑے گھرانے میں پناہ ملی۔ لیکن بن ماں باپ کا بچہ بادشاہی محل میں ہو، تو بھی۔ بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ بچوں کی دنیا میں ایک بادشاہت ایسی بھی ہے جو صرف اپنے ماں باپ کے جھونپڑے میں نصیب ہوتی ہے۔ یہی بادشاہت تھی جو ڈاکٹر تاثیر کو نصیب نہ ہوئی۔ بچپن میں روح کی یہ احتیاط بالعموم طرح طرح کے ذہنی اعوجاج پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی استقامتِ طبع کا سب سے پہلا کرشمہ یہ تھا کہ انہوں نے ابتدائے عمر میں اپنا نفسیاتی توازن برقرار رکھا اور حالات سے کبھی مغلوب نہ ہوئے۔ وہ نہ اُس وقت کسی ذہنی عارضے میں مبتلا تھے، نہ بعد میں اس قسم کا کوئی مرض انہیں لاحق ہوا۔ میں نے انہیں دو ایک مرتبہ ان کے لڑکپن کے دنوں میں بھی دیکھا ہے۔ میں خود بچہ تھا لیکن ان کی چھوٹی سی لال ٹوپی سر میں دھنسی ہوئی، ان کا نوخیز چہرہ اور شریر نگاہ، ان کا چھریرا طفلانہ بدن، ان کا اچکن نما کوٹ جس کی دونوں جیبوں میں انہوں نے اپنے ہاتھ ایک ادائے اعتماد سے ٹھونس رکھے تھے۔ اب تک میری نظر کے سامنے ہے۔ وہ مجھ سے دو چار سال بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے اور لڑتے تھے۔ اور مجھے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُس زمانے میں ان کی بے انتہا شوخی یتیمی کے خلاف ان کا اظہارِ ردِ عمل تھی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

وہ میرا دوست تھا۔ وہ میرا دوست میرا بھائی تھا۔ اس سے جھگڑے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتا تھا مگر وہ دوست دشمن کے اس قدر قریب رہتا تھا کہ اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کے آ جانے سے سب کچھ بھلا دینا پڑتا تھا اس کی شخصیت مجبور کر دیتی تھی کہ سب کچھ بھلا کر اس کے شانوں سے شانے ملا کر بیٹھ جائیں تاکہ ہم بھی زندگی کے اس بھرپور نظریے سے قریب تر ہو جائیں جس سے ڈاکٹر تاثیر بہرہ ور تھا۔

ایس ایم شریف

صوبے میں نظام تعلیم کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا کام شروع ہوا اور اس کے لیے محکمے کی طرف سے تعلیم کے ماہرین کی کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ ان کمیٹیوں میں ڈاکٹر تاثیر بھی شریک تھا۔ سب نے اپنی استعداد، مطالعہ اور تجربے کے مطابق اس مبارک کوشش میں حصہ لیا لیکن ڈاکٹر تاثیر کے سوچنے اور معاملات میں غور کرنے کا انداز سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ تعلیم کے مسئلے کو چند نصاب کی کتابوں اور تدریسی طریقوں تک محدود نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے قوم کی ساری زندگی تھی اور اس کا مستقبل تھا۔ اس بارے میں اس کی نظر بڑی وسیع تھی۔ جب کبھی بھی کسی تعلیمی مسئلے پر میری اس سے گفتگو ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ تعلیم کا تعلق خالی مدرسوں اور کالجوں کی چار دیواری سے نہیں، یہ چیز قوم کی مجموعی زندگی پر حاوی ہے تعلیم کا تعلق قوم کے ادب، اس کے مختلف فنون اور تہذیب سے ہوتا ہے۔ اس لیے ان میں گہرا رابطہ ہونا چاہیے تاکہ تعلیم اور تہذیب کے قدم ایک ساتھ اٹھ سکیں۔

ملک میں تجربہ کار استاد اور ماہرین تعلیم ہیں مگر بہت کم ڈاکٹر تاثیر انہی ہستیوں میں سے تھا

لیکن ان چند ہستیوں میں بھی اسے خاص امتیاز حاصل تھا۔ اُسے دنیاوی اموراور بالخصوص تعلیمی معاملات میں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ وہ کسی معاملے میں رائے دینے سے پہلے اس کی چھان بین کر لیتا، اس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتا اور اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو بھانپ لیتا اور پھر کسی قطعی نتیجے پر پہنچتا۔ کمال یہ تھا کہ اس کے قائم کئے ہوئے نتیجے ہمیشہ صحیح ہوتے۔ اس کے مشورے خالی باتیں ہی نہیں بلکہ عملی ہدایات بھی ہوتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ شاعرانہ تخلیق رکھنے والا انسان معاملات پر اتنے ٹھنڈے دل سے کیونکر غور کر سکتا ہے۔

تعلیمی پروگرام کا جہاں تک تعلق ہے اس صوبے میں شاید ہی کوئی تعمیری کام ایسا ہوگا جس میں ڈاکٹر تاثیر کا وسیع مطالعہ، اس کی گہری نظر اور عملی تجربہ شامل نہ ہو۔ آرٹ کونسل، بزم اقبال اور دارالترجمہ بڑی حد تک اس کی دُور رس نگاہوں اور مفید مشوروں کا نتیجہ ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں فقط اس صوبے تک محدود نہ تھیں۔ اس جگہ اُس نے اپنے ذوق وشوق، خوش اسلوبی اور اہتمام سے کام کیا کہ اس کی دلچسپیاں مرکزی حکومت کے وسیع دائرے تک پھیل گئیں۔ اور وہاں کے تعلیمی منصوبوں اور کارگزاریوں میں اس کے عملی مشورے شامل ہونے لگے۔

ڈاکٹر تاثیر سے مشورے کے لیے کسی رسمی ملاقات کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور اس کے لیے کوئی جگہ یا وقت بھی معین نہ تھا۔ وزیر تعلیم کا دفتر، کھانے کا کمرہ ہو یا دوستوں کی محفل، وہ بڑی متانت اور سادگی کے ساتھ بڑے سے بڑے مسئلے پر گفتگو کر سکتا تھا۔ اس کی تفریحی باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی کارآمد نکتہ ضرور ہوتا تھا۔ اس کی سادہ اور معمولی باتیں بھی میری بہت سی کاروباری مشکلات حل کر جاتی تھیں۔

ڈاکٹر تاثیر میں اور مجھ میں زندگی کا کاروباری رابطہ ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر تاثیر میرا ہم

جماعت اور دوست بھی تھا۔ ہمارے کاروباری رابطے نے دوستی کے رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیا اور ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے۔ مجھے جب کبھی بھی اس کے یہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو یوں محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر تاثیر کا گھر پیار کی فضا میں رچا ہُوا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کے قہقہے، اس کی بیوی کے چہرے کی شگفتگی، بچوں کی دلآویز مسکراہٹ دلوں کے سکون اور خلوص کا پتہ دیتی تھی۔ کتنا پیارا تھا ڈاکٹر تاثیر!

ڈاکٹر تاثیر کی ادبی حیثیت اور عظمت مسلّم ہے۔ ہم سب اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ دوستوں کی اس عزت اور مسرت میں برابر کا شریک ہوں لیکن ڈاکٹر تاثیر میرے لیے ادیب، شاعر اور نقاد کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک مخلص دوست اور ایک صحیح مشورہ دینے والا مشیر، ڈاکٹر تاثیر ایک زندہ، جیتا جاگتا تجربہ تھا۔ جس سے ملنا گویا زندگی کی عملی رہنمائی سے ہمکنار ہونا تھا۔

مولانا عبدالمجید سالک

نیرنگِ خیال'' کے جاری ہونے پر اس کے جوہر کھلے اور اس نے وہ شعبہ ادب اختیار کیا جس کی طرف ہم لوگ ابھی متوجہ نہ ہوئے تھے۔ یعنی ادب اور آرٹ کی تنقید (جدید اصول تنقید کے ماتحت) ....

امتیاز و بخاری کو تو ڈاکٹر اقبال کے پاس جانے کا بہت کم موقع ملتا تھا، لیکن میں اور ڈاکٹر تاثیر اکثر جاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر تاثیر کی وسعت مطالعہ اور ان کی اہلیت تحریر سے ڈاکٹر صاحب بہت مسرور و مطمئن ہوتے تھے اور آرٹ کی تنقید میں ڈاکٹر تاثیر کا نقطۂ نگاہ مجھے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

سیّد وقار عظیم

دہلی میں ایک مختصر سی ادبی صحبت میں حیات اللہ انصاری نے ن۔م راشد کی شاعری پر اپنا وہ مقالہ پڑھا تھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ سننے والوں میں اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر بھی تھے۔ مقالہ کے تحلیل اور تجزیاتی انداز کو عام طور پر سراہا گیا۔ سامعین میں سے بعض نے مقالہ نگار سے سوال کئے اور جواب سن کر مطمئن ہو گئے۔ اب تک ڈاکٹر تاثیر خاموش بیٹھے تھے۔ خاموش سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ بالکل چپ بیٹھے تھے۔ وہ ہر سوال اور جواب کے درمیان کوئی نہ کوئی لطیف اور شگفتہ بات کہتے اور مسکرا رہے تھے۔ جب باقی سامعین کی طرف سے سوال جواب کا سلسلہ ختم ہو چکا تو ڈاکٹر تاثیر اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے دو ایک دوستوں سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہہ کر اور اپنی پوری شخصیت کو مجسم تبسم بنا کر صاحب مقالہ سے سوال کیا۔ مقالہ نگار نے دوسرے سوالوں کی طرح اس کا بھی کوئی تشفی بخش جواب دے کر گفتگو کو ختم کر دینا چاہا۔ لیکن ڈاکٹر تاثیر صاحب کا سوال صرف جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں ہنگامہ آرائی کے خیال سے کی گیا تھا اور اس لیے جواب میں انہوں نے سوال کا ایک اور پہلو نکال لیا۔ اس مرتبہ سوال میں طنز بلکہ تمسخر کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ مقالہ نگار نے اسے محسوس کیا اور لازمی طور پر ان کا جواب اس احساس کا ردعمل بن کر زباں پر آیا۔ اس میں کسی قدر تیزی تھی۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب بجائے اس کے کہ اس تیزی سے کبیدہ خاطر ہوتے پہلے سے زیادہ شگفتہ نظر آنے لگے اور اس تیز جواب کو ایک اور اعتراضی سوال کی صورت دے دی۔ سوال کے اس اعتراضی رنگ نے مقالہ نگار کو بھڑکا دیا اور ان کی تیزی میں تلخی آ گئی اور اب ادبی، فلسفیانہ اور جمالیاتی گفتگو نے لفظی پیکار کی صورت اختیار کر لی۔ دونوں طرف

تیزی اور دونوں طرف تندی۔ فرق صرف یہ تھا کہ حیات اللہ صاحب کی تیزی اور تندی میں تلخی بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں ڈاکٹر تاثیر صاحب کی تیزی اور تندی میں شوخی ان کی ہم نوا تھی۔ وہ تلخ سے تلخ بات کا جواب مسکرا کر قہقہہ لگا کر اور پہلے سے زیادہ شگفتہ ہو کر دے رہے تھے اور اس شدید تضاد سے حاضرین کے ماحول میں ادبیت تو یقیناً باقی نہیں رہی لیکن بھرپور زندگی کے وجود کا احساس ہر شخص کو تھا۔ اس کے بعد میری ملاقات ڈاکٹر تاثیر صاحب سے ہوئی اور حیات اللہ صاحب سے بھی۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی حیات اللہ صاحب کی تلخی باقی تھی اور ڈاکٹر تاثیر صاحب گزرے ہوئے واقعہ کا ذکر شوخی شگفتگی اور لطف سے کر رہے تھے۔ جو کچھ دوسروں کے لیے کڑوا تھا اس میں ان کے لیے اب بھی کڑواہٹ نہیں تھی۔ اس لیے کہ انہیں زندہ رہنے اور زندگی کی ہر آن سے پوری لذت حاصل کرنے سے زیادہ عزیز کوئی دوسری چیز نہ تھی۔

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کی ایک غیر معمولی ادبی شخصیت تھے اور علم، ذوق اور ذہانت کی یک جائی کی ایک بہت بلیغ مثال تھے۔ وہ نہایت بے چین اور مضطرب مزاج کے مالک تھے۔ مگر ان کی یہ بے چینی مثبت اور ان کا یہ اضطراب تخلیقی تھا۔ شاید اسی لیے اہل الرائے نے کہا ہے کہ ایک بڑے فن کار کے مزاج کی بے قراری، اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نہ صرف ایک خوش گو شاعر تھے بلکہ ایک انتہائی نکتہ رس اور نکتہ سنج نقاد تھے اور اس کے ساتھ ہی نکتہ طرازی بھی ان کے مضامین کا ایک ایسا جوہر تھا جو بہت کم نقادوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ دوسرے کے اٹھائے ہوئے سوالات تو حل ہوتے ہی رہتے ہیں مگر صورتِ حال کے گہرے اور ہمہ گیر

جائزے کے بعد اپنے سوالات اٹھانا بہت دشوار کام ہے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا مختصر سے مختصر مضمون اور چھوٹے سے چھوٹا تبصرہ دیکھ لیجئے، آپ کو اس میں ایسے نئے سوالات کا بہر حال سامنا کرنا پڑے گا جو آپ کے اندر علمی اور فنی کرید کو بیدار کرتے جائیں گے۔ اُردو تنقید میں یہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تنقید میں وہ کہیں کہیں بے لحاظ بھی نظر آتے ہیں مگر وہ بدلحاظ کبھی نہیں ہوئے۔ جہاں تک ان کی بے لحاظی کا تعلق ہے تو وہ ان کی حق گوئی کی پیداوار ہے اور سچ عموماً تلخ ہوتا ہے۔

آپ ''مقالاتِ ڈاکٹر تاثیر'' کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان مضامین کا مصنف معلومات کا ایک سمندر تھا اور اس کی یہ معلومات صرف شعر و ادب پر ہی نہیں بلکہ جملہ فنونِ لطیفہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مرتب اور ''مجلس'' نے کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا ہر اہم نثر پارہ اس تاریخی مجموعے میں شامل ہو جائے۔ جہاں مضامین میں تکرار کا احتمال تھا، وہاں بہتر نثر پارہ منتخب کر لیا گیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر تاثیر کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نظموں میں قافیہ ردیف کی پابندی بھی ہے اور نظم معرّیٰ بھی۔ وہ آزاد نظم کے بانی تو نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی طویل نظم ''یدِ بیضا'' اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ ان کے ادبی معرکے بھی ہوئے ہیں جن میں کسی نے کسی کا لحاظ نہیں کیا۔ ان کی تنقید کبھی تاثراتی ہے کبھی تجرباتی۔ تاثراتی تنقید ان کے مزاج کے مطابق تو ہے مگر ان کے علم و فن سے ہم آہنگ نہیں۔ تاہم مغربی اور مشرقی لٹریچر پر ان کے عبور نے ان کی تنقید کو ایک منفرد اسلوب دیا ہے۔ البتہ بعض اوقات وہ بات کرتے

ہوئے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں جس کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری کو روشناس کرانے کے لیے انہوں نے مشرقی اور مغربی مصوری کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی بنیاد پر مصور مشرق کے کام کو فنی نقطۂ نظر سے بھی خوب اجاگر کیا۔ مصوری پر ڈاکٹر تاثیر کے مضامین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مصوری مناظر کی نقل نہیں بلکہ ان کے بارے میں فنکار کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہے۔ اور یہ کہ اگر ایک مصوری اپنی دنیا کو اچھی طرح سمجھتا ہے تو وہ بہتر مصور ہوگا۔ ہر بڑا عالم مصور نہیں مگر ہر بڑا مصور بڑا عالم ضرور ہوگا۔ مصوری ہی نہیں ہر آرٹ میں یہی بات ہے۔ شاعری میں اقبال کی بلندی کا یہی راز ہے۔ مصوری پر ان کے مضامین چھپتے تو رہے ہیں لیکن ان کی فنی نوعیت کے پیشِ نظر کسی نے انہیں مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آتشیں مزاج، ادبی چھیڑ چھاڑ کی عادت اور انتظامی ذمہ داریوں نے انہیں جم کر کام کرنے کی مہلت نہ دی۔ انہوں نے ایک مختصر ناول ''کنول'' بھی لکھا لیکن اسے کوئی خاص پذیرائی نہ مل سکی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر نے افسانے اور ڈرامے لکھے اور کئی ایک تراجم بھی کیے۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> ''وہ شاعروں میں شاعر تھے، فلسفیوں میں فلسفی، ادیبوں میں ادیب، نقادوں میں نقاد، معلموں میں معلم۔ شوخی و شرارت ان کے مزاج کا ایک بنیادی عنصر تھی۔ انتظامی امور میں ان کی صلاحیت کمال کی تھی۔ وہ جہاں جہاں بھی رہے، انہوں نے متعلقہ ادارے کی فلاح و بہبود کے لیے نئی نئی تجاویز سوچیں اور ان پر عمل درآمد کیا۔ اُردو کے فروغ اور نوجوانوں کے ادبی ذوق کو جلا دینے کے لیے اسلامیہ کالج میں ''بزم فروغ اردو'' کا قیام ان کی ایک اہم کاوش ہے۔''

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر تاثیر اُردو کے نامور ادیب اور نقاد ہیں۔ وہ اقبال کے ذاتی دوست بھی تھے اور ہم جلیس بھی۔ اپنی بے شمار مصروفیات کی بنا پر وہ اقبال پر کوئی مستقل کتاب نہ لکھ سکے۔ البتہ اس موضوع پر ان کی متفرق نگارشات ایسی ہیں کہ ان سے ایک حسین گلدستہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی وفات کے بعد ان کی نگارشات جمع کرنے کے لیے مولانا عبدالمجید سالک، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر سعید اللہ اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پر مشتمل ایک چار رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کی کارکردگی کے متعلق ہنوز کچھ معلوم نہیں۔

ڈاکٹر تاثیر بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی ذہانت ضرب المثل اور وسعتِ مطالعہ حیران کن تھی۔ انہیں بے شمار علوم وفنون پر دسترس حاصل تھی۔ ذکاوت ہنگامہ، ہنگامہ خیزی اور معرکہ آرائی ان کے مزاج میں شامل تھی۔ بدقسمتی سے وہ اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ انہوں نے سیلانی طبیعت کے باوجود بہت کچھ لکھ ڈالا۔ سنجیدہ ادبی اور تنقیدی مضامین بھی بڑی تعداد میں لکھے تھے جو منتشر تھے اور اتنا وقت گزرنے کے ساتھ ان پر گردِ فراموشی کی تہہ جم چکی تھی۔

ڈاکٹر ریاض قدیر

ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر اُردو ادب کی ایک بلند پایہ شخصیت تھی۔ بیسویں صدی کے اُردو ادب میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کی ذات بہت سے علمی و ادبی اوصاف سے متصف تھی۔ وہ ایک منفرد لہجے کے خوش گو شاعر، صاحب طرز ادیب اور معتبر نقاد تھے۔ اڑتالیس برس کی عمر میں تاثیر کی اچانک وفات اُردو ادب کے لیے ایک سانحہ سے کم نہ تھی۔

عمر گریزاں اگر انہیں چند برس کی اور مہلت دیتی تو وہ یقیناً اُردو ادب میں اعلیٰ پائے کی ادبی تصانیف کا اضافہ کر جاتے۔ تاہم تاثیر کے دستیاب ادبی سرمایہ کی روشنی میں اس حقیقت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ تاثیر علم و ادب کا ایک دریا تھے جس کی موجوں نے ربع صدی تک اُردو ادب میں تحریک و تموج پیدا کیے رکھا اور اپنے پیچھے علم و ادب کے کئی گہرہائے آبدار چھوڑ گیا۔

محترمہ ممتاز اختر مرزا

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے ''مقالات'' کا مجموعہ ان کی ایسی ادبی تحریروں پر مشتمل ہے جو ان کی ادبی زندگی کے آغاز یعنی ۱۹۱۸ء سے لے کر ان کی وفات (۱۹۵۰ء) اور اس کے چند سال بعد تک مختلف ادبی مجلوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رسائل میں ''نیرنگ خیال'' سرِ فہرست ہے۔ ڈاکٹر تاثیر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک اس ماہنامے کے نائب مدیر رہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا اسلوب تحریر اسی ماہنامے سے وابستگی کے زمانے میں نقطۂ عروج پر تھا۔ علمی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں موضوعات میں تنوع آتا گیا۔ چنانچہ فلسفۂ الٰہیات سے لے کر حالاتِ حاضرہ کے مسائل تک، ڈاکٹر تاثیر کے قلم کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان ربع صدی کا ایک زمانہ ایسا بھی آیا جس میں لاہور، ہندوستان بھر میں تخلیقی ادب کا مرکز تصور ہونے لگا۔ اس دور کو رسائل اور جرائد کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اظہار کی کثرت نے ابلاغ کی مختلف صورتیں بھی از خود مہیا کر دی تھیں۔ اس دور کے جرائد میں مخزن، نیرنگ خیال، عالمگیر، شاہکار، ادبی دنیا، کارواں، نرگس، قوس قزح اور بعد میں ماہِ نو، ادب لطیف' آج کل اور نقوش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کی نگارشات ان میں سے اکثر مجلوں کی

زینت بنتی رہی ہیں۔ وہ اپنے نام کے علاوہ فرضی ناموں سے بھی لکھتے تھے۔ ان ناموں میں سے ایک نام ''نظامی قدوسی'' تھا۔ ایک روایت کے مطابق ایک نام ''مفکر'' بھی تھا جو کبھی کبھی وہ اپنی انگریزی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ صحافت کے معرکوں میں بقول آفتاب احمد خاں آپ ''ڈاکٹر حجازی'' کے نام سے آتے تھے اور شاعری میں کبھی کبھی ''فتولہار'' کے نام سے بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ادبی معرکے اور ادبی مجادلے ڈاکٹر تاثیر کی شخصیت کے اہم جز تھے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور ڈاکٹر تاثیر کے ادبی معرکے اس ضمن میں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

کتابیات و حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تاثیر شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر ریاض قدیر، مطبوعہ اُردو اکیڈمی پاکستان، لاہور ۲۰۰۵ء

۲۔ تاثیر زندہ باد۔ حمید احمد خان، مطبوعہ کریسنٹ ڈاکٹر تاثیر نمبر ۱۹۵۱ء

۳۔ میر امجد طفل۔ ڈاکٹر تاثیر، کریسنٹ یادگار نمبر فروری۔ اپریل ۱۹۵۱ء

۴۔ مکتوب سلمیٰ ڈاکٹر تاثیر بنام ڈاکٹر ریاض قدیر مورخہ ۲ راگست ۱۹۹۴ء

۵۔ ڈاکٹر تاثیر افضل حق قریشی۔ اقبال کا فکر و فن، مطبوعہ بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۹۴ء

۶۔ نامہ کیمبرج، مطبوعہ بھارت اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۳۴ء

۷۔ عزیزم کے نام" محمود نظامی کے نام کیمبرج سے ڈاکٹر تاثیر کے خطوط مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو۔

۸۔ ڈاکٹر تاثیر اقبال کے حضور، مطبوعہ ہفت روزہ قندیل لاہور ۱۲ را پریل ۱۹۵۰ء

۹۔ مضمون "ڈاکٹر تاثیر" از بلقیس ڈاکٹر تاثیر مطبوعہ نقوش لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء جنوری

۱۰۔ میاں امیر الدین۔ یادِ ایام مطبوعہ انجمن حمایت اسلام

۱۱۔ ناممکن کی جستجو۔ حمید نسیم۔ فضلی سنز اُردو بازار کراچی

۱۲۔ اسلامیہ کالج کی سالانہ رپورٹ ۱۹۳۹ء

۱۳۔ اسلامیہ کالج کی سالانہ روداد ۵۰۔ ۱۹۳۹ء

۱۴۔ انارکلی۔ مخلص اور نیاز مند، نیرنگِ خیال فروری ۱۹۳۲ء

۱۵۔ یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں، مطبوعہ سالنامہ کارواں لاہور ۱۹۳۳ء

۱۶۔ بلقیس ڈاکٹر تاثیر کی عابد صاحب سے گفتگو نمبر ۱۹۵۰ء

۱۷۔ پیش لفظ آتشکدہ، دیوان ڈاکٹر تاثیر، سید عابد علی عابد

۱۸۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، بیادِ صحبت نازک خیالاں، مکتبہ دانیال کراچی۔ دوسری بار: دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۹۔ محمد احمد خان، اقبال کا سیاسی کارنامہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔۱۹۷۷ء

۲۰۔ ڈاکٹر ایم۔ڈی۔تاثیر، اقبال کا فکر و فن مرتبہ افضل حق قرشی، بزم اقبال لاہور، نومبر ۱۹۹۳ء

۲۱۔ ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر، "ہائے وہ میر کارواں نہ رہا" نقوش، لاہور، سالنامہ، دسمبر ۱۹۵۰ء

۲۲۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود (حصہ سوم) شیخ غلام علی اینڈ سنز، چوک انارکلی لاہور۔
اشاعت دوم ۱۹۸۷ء

۲۳۔ جاوید طفیل (مدیر) نقوش محمد طفیل نمبر (جلد دوم)، شمارہ نمبر ۱۳۵، جولائی ۱۹۸۷ء۔

۲۴۔ محمد حمزہ فاروقی (مرتب) مکاتب بنام غلام عباس، القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور، ۹۹۶

۲۵۔ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، مکتبہ زریں، رستم پارک، لاہور، ۱۵/جون، ۱۹۷۷.

۲۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا (مرتب)، عبدالرحمٰن چغتائی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۸۰ء

۲۷۔ شورش کاشمیری، نورتن، مطبوعات چٹان لمیٹڈ ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور، جون ۱۹۶۷ء

۲۸۔ عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں، چند تاثرات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء

۲۹۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، یاد عہد رفتہ، ادارۂ ادب و تنقید لاہور۔۱۹۸۸ء

۳۰۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، وے صورتیں الٰہی، قومی کتب خانہ لاہور۔دسمبر ۱۹۷۶ء

۳۱۔ شیخ محمد عبداللہ، آتش چنار، چوہدری اکیڈمی لاہور۔۱۹۸۶ء

۳۲۔ عبدالمجید سالک، یاران کہن، مطبوعات چٹان لاہور۔۱۹۵۵ء

۳۳۔ محمد طفیل احمد (مدیر)، نقیب، دسمبر ۱۹۹۳ء

۳۴۔ محمود نظامی، عزیزم کے نام، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، اساطیر، میاں چیمبر، ۳ ٹمپل روڈ لاہور، ۲۰۰۲ء